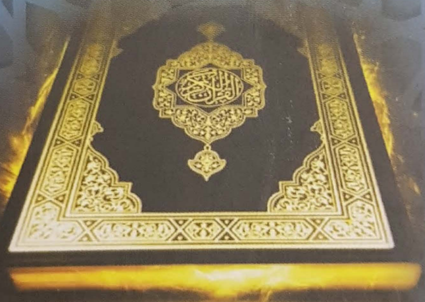
شاہ عبدالقادرؒ
کی
قرآن فہمی



toobaa-elibrary.blogspot.com

محمد فاروق خاں

شاہ عبدالقادرؒ کی قرآن فہمی

محمد فاروق خاں

https://telegram.me/ilmokitab

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

https://telegram.me/ilmokiab

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۱۴۴۲

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب		شاہ عبدالقادرؒ کی قرآن فہمی
مولف		محمد فاروق خاں
صفحات		۱۰۴
اشاعت		
پہلا ایڈیشن	:	مارچ ۲۰۱۷ء
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	-/۵۲ روپے
ناشر		مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

فون: ۲۶۹۸۱۶۵۲، ۲۶۹۸۴۳۴۷ فیکس: ۲۶۹۸۷۸۵۸

E-mail: mmipublishers@gmail.com

Website: www.mmipublishers.net

مطبوعہ ایچ ایس آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی-۲

ISBN 81-8088-432-0

SHAH ABDUL QADIR KI QURA'N FAHMI (Urdu)
by: Muhammad Farooq Khan
Pages: 104
Price: ₹52.00

https://telegram.me/ilmokiab

فہرست

تعارف	۵
علاّمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ	۷
پیدائش اور تعلیم و تربیت	۷
تقویٰ	۸
توکل	۹
محبت رسولؐ	۱۰
تواضع	۱۰
رعب و ہیبت	۱۱
قرآن مجید سے شغف	۱۱
معقولات سے عدم دلچسپی	۱۲
لوگوں کی تعلیم و تربیت	۱۳
غیر مسلموں سے ربط و تعلق	۱۴
فہم و بصیرت	۱۵
علمی کارنامہ	۱۷
اولاد	۱۹
انتقال	۱۹
شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی قرآن فہمی	۲۰
خدا کی ہستی ہی اصل ہے	۲۲
اصل معاملہ خدا کی ذات سے ہے	۲۶
شرک	۲۸
اصل دین	۳۰
وحدتِ دین	۳۲
آسان دین	۳۶
دین فطرت	۳۷

https://telegram.me/ilmokiab

معقول روش	۴۱
منکرین کا اصل مرض	۴۴
مماثلت	۴۵
پیغمبر کی حیثیت	۴۷
حکمت	۴۹
قرآن کی قسمیں	۵۱
تخلیق کائنات عبث نہیں	۵۲
خدا کی سنت	۵۳
کائنات کی گواہی	۵۷
تاریخ کیا کہتی ہے؟	۵۸
انفس کی شہادت	۵۹
نظریۂ آخرت	۶۱
آواگون کی تردید	۶۵
حقائق	۶۶
نفسیاتی حقائق	۶۸
نگاہِ حقیقت شناس	۷۳
موت کیا ہے؟	۷۴
حساس دل کی یافت	۷۸
مشاہدہ ومطالعہ	۸۲
زمانہ کی حقیقت	۸۶
مسئلۂ تقدیر	۸۷
لطیف استدلال	۸۹
لطیف استنباط	۹۴
اَمثال	۹۶
بعض اہم مقامات	۹۸

https://telegram.me/ilmokiab

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

علمائے اسلام کی جو مختصر سے مختصر فہرست مرتب کی جائے گی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نام اس میں ضرور آئے گا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ دور زوال کے مسلم سماج کے امراض کی بہترین تشخیص کی اور اُن کا صحیح علمی اور عملی علاج پیش کیا، بلکہ تفسیر، حدیث، فقہ، اجتہاد و تقلید، حکمت دین، خلافت راشدہ، تصوف، معاشیات، سیاسیات، ہر موضوع پر تحقیقی نگاہ ڈالی۔ افسوس کہ اب تک ان کے افکار کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور نہ ان کی قدر و قیمت پہچانی گئی۔

نہ صرف انھوں نے بلکہ کئی پشت تک اُن کے خانوادے، نیز ان کے شاگردوں نے دین کی بہترین علمی و عملی خدمات انجام دیں، ان ہی کی نسل اور ان ہی کے شاگردوں اور مریدوں میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنہوں نے خلافتِ راشدہ کے طرز پر برصغیر میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدو جہد کی، اور اس سلسلے میں عظیم جانی و مالی قربانیاں دیں۔ ان کی اس دینی تحریک کے برصغیر پر وسیع اور ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے، آج برصغیر میں جو دینی ادارے، دینی جماعتیں، دینی تحریکات اور اسلامی اثرات ہیں، بہت بڑی حد تک اسی خانوادے کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اصولِ تفسیر پر فارسی میں ایک مختصر کتاب "الفوز الکبیر" کے نام سے لکھی جو اصولِ تفسیر کی ضخیم کتابوں پر بھاری اور ان کی مجتہدانہ بصیرت کا شاہ کار ہے۔ اس میں قابلِ ذکر اضافہ بعد کے ادوار میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تفسیری افادات سے ہوا۔ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا اور اس پر مختصر حواشی بھی لکھے جو بہت قیمتی ہیں۔ شاہ صاحب کے بعد اُن کے ایک صاحب زادے شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اردو میں قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اور دوسرے صاحب زادے شاہ عبد القادرؒ نے اردو میں با محاورہ ترجمہ کیا، جو

https://telegram.me/ilmokiab

اردو کا قدیم بہترین نثری نمونہ اور قرآن مجید کا بہترین ترجمہ ہے، جس پر جتنا غور کیجیے اس کی لطافتیں واضح ہوتی چلی جاتی ہیں۔

شاہ عبد القادرؒ نے ترجمے کے علاوہ مختصر تفسیری حواشی بھی لکھے۔ یہ حواشی خاصی افادیت کے حامل ہیں۔ ہمارے دوست جناب محمد فاروق خاں صاحب نے جو قرآن مجید کے ہندی کے مترجم ہیں اور قرآن مجید پر غور وخوض کا شغف رکھتے ہیں، ان تفسیری حواشی کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ پیش نظر کتاب اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ امید ہے، اس کتاب کے ذریعے شاہ صاحبؒ کے تفسیری حواشی کے مختلف گوشوں کی افادیت سامنے آسکے گی، اور شاہ صاحب کے ترجمے وتفسیری حواشی سے استفادے کی طرف مزید توجہ ہوسکے گی۔ کتاب کے آغاز میں شاہ عبد القادر صاحبؒ کی زندگی کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔

حامد علی

۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹

https://telegram.me/ilmokiab

علّامہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ان مخصوص بزرگوں میں سے ہیں، جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کے یہاں علم کے مقابلے میں تقویٰ کو غلبہ حاصل ہے، یا تقویٰ کے مقابلے میں علم کو فوقیت حاصل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاہ صاحب علم اور عمل دونوں کے پیکر تھے۔ وہی کہتے تھے جس کی گواہی ان کا دل دیتا تھا، اور جس کی شہادت ان کا دل دیتا اسی کو عملاً اختیار کرتے تھے۔

پیدائش اور تعلیم وتربیت

شاہ عبدالقادر صاحبؒ خاندانِ ولی اللہ کے چشم و چراغ تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی کے تیسرے صاحب زادے تھے۔ ۱۱۶۷ھ (مطابق ۱۷۳۸ء) میں پیدا ہوئے، نسب چونتیس پشت کے واسطے سے امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے۔

شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم بن وجیہ الدین شہید بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قواذن بن قاضی قاسم بن کبیر عرف قاضی بدہا بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین المفتی عرف قاضی پران بن شیر ملک بن عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر والحاکم بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمالوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر الخطابؓ (۱)

(۱) مجموعہ کمالاتِ عزیزی ص ۳

https://telegram.me/ilmokiab

شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد مکرم کے سایۂ عاطفت میں پائی۔ تکمیلِ علوم اپنے برادر شاہ عبدالعزیز سے فرمائی اور تفسیر وحدیث اور علم فقہ میں خاص مقام حاصل کیا۔(۱)

سلوک وتصوف میں شیخ عبدالعدلؒ دہلوی سے راہ نمائی حاصل کی۔ اس سلسلے میں گیارہ سال تک شاہ عبدالعدل نقشبندی کے زیرتربیت رہے۔(۲) اس سلسلہ میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک قول بھی نقل کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں حضرت مجددؒ کے سلسلہ کا زیادہ معتقد نہ تھا، لیکن جب سے میں نے شاہ صاحب کو اور فلاں بزرگ کو دیکھا ہے اس وقت سے اس سلسلہ کا معتقد ہو گیا۔ اگر یہ سلسلہ ناقص ہوتا تو اس سلسلے میں ایسے لوگ داخل نہ ہوتے۔''

شاہ احمد سعیدؒ فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا کشف نہایت عمدہ تھا۔ انھوں نے بارہ سال تک مجاہدہ اور اس طریقہ کے بعض خلفا سے استفادہ کیا تھا۔(۳)

شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اردو زبان وادب کے سلسلے میں خواجہ میر درد کی صحبت بھی اختیار کی، اصل میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے بچوں سے فرمایا کرتے تھے کہ ''اصول حدیث اور اصولِ فقہ کی طرح حصول زبان بھی ایک فن ہے۔ خواجہ میر درد کی صحبت اس فن کے لیے غنیمت سمجھو'' چناں چہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔(۴)

تقویٰ

شاہ عبدالقادر صاحب اللہ کی بزرگی اور اس کی عظمت کا پورا احساس رکھتے تھے، ان کے تقویٰ وطہارت کی وجہ سے سارا خاندان ان کی عزت وتعظیم کرتا تھا۔

شاہ صاحبؒ نے تمام عمر مسافرانہ انداز میں بسر کی۔ وہ کن فی الدنیا کانک غریب او عابری سبیل کی تصویر تھے۔ دنیا اور اہل دنیا کی طرف انہیں التفات نہ تھا۔ اس چیز نے اُنہیں ایسا مستغنی اور بے غرض بنا دیا تھا، جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ شاہ صاحب کچھ ایسے آگاہِ راز

(۱) انوار الباری مجموعہ افادیات علامہ انور شاہ کشمیریؒ جلد دوم، ص ۲۰۵

(۲) روایت مولانا زید ابوالحسن صاحب

(۳) مقاماتِ خیر

(۴) لال قلعہ کی جھلک، ص ۶۳

https://telegram.me/ilmokiab

اور حقیقت آشنا تھے کہ اُنہیں اس کی حاجت نہ تھی کہ سکون دل کے لیے وہ دنیا کی رنگینیوں اور زوال پذیر چیزوں کا سہارا لیں۔ یہی وجہ ہے کہ گوشہ نشینی اُنہیں پسند خاطر تھی۔

توکل

شاہ صاحب توکل پیشہ تھے۔ انھوں نے شروع ہی سے اپنی ضروریات زندگی کو نہایت مختصر کر رکھا تھا۔ ایسی صورت میں توکل اور قناعت اُن کے لیے ایک فطری بات تھی اس کے لیے اُنہیں اپنے آپ سے کوئی کشمکش نہیں کرنی پڑی۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے مسجد اکبر آبادی(۱) کو اپنی جائے قیام بنایا، اور مسجد ہی کے حجرے میں اپنی تمام عمر گزاری(۲) اس وقت جب کہ میں یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں اپنے دل میں عجیب کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کتنے عظیم تھے شاہ صاحب کہ وہ دنیا کے طلب گار نہ ہوئے۔ خدا کی یاد اور رسولﷺ کی محبت یہی دو چیزیں تھیں جن کو شاہ صاحبؒ نے زندگی کا اصل سرمایہ سمجھا تھا۔

شاہ صاحب کے پاس جو کچھ جائداد تھی اسے انھوں نے اپنی زندگی میں شرعی قانون کے مطابق اپنی صاحب زادی اور اپنے بھائیوں کے نام کر دی تھی، اور اپنے لیے صرف توکل کو پسند فرمایا ان کی یہ عادت بھی تھی کہ وہ کسی کا ہدیہ وغیرہ نہیں لیتے تھے(۳) ان کے بڑے بھائی شاہ عبد العزیزؒ صاحب ان کے لیے کھانا بھجوادیا کرتے تھے، اور جب اُنہیں کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہی ان کے لیے کپڑے کا انتظام کر دیتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے چھوٹے بھائی سے نہایت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے طرزِ تخاطب اور مختلف واقعات سے ہوتا ہے(۴)

---

(۱) مسجد اکبر آبادی جس میں شاہ صاحبؒ رہتے تھے، اس کے بارے میں سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ یہ مسجد اعزاز النساء بیگم عرف اکبر آبادی بیگم نے جو مغل حکمراں شاہ جہاں کی بیگم تھیں تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد کی عمارت ۶۳ گز لمبی اور ۱۷ گز چوڑی تھی۔ آگے ۶۳ گز لمبا اور ۵۷ گز چوڑا ایک چبوترہ بھی سنگ سرخ کا تھا۔ چبوترے کی اونچائی ساڑھے تین گز تھی۔ اس کے آگے سنگ سرخ کا ایک حوض بھی تھا، صحن مسجد کی لمبائی ۱۵۴ گز اور چوڑائی ۱۰۴ گز تھی۔ اس کے گرد طالب علموں کے لیے حجرے بنے ہوئے تھے۔ (آثار الصنادید، ص ۲۸۷)

(۲) سیر المصنفین از محمد یحییٰ بی-اے علیگ، بحوالہ واقعات دار الحکومت دہلی

(۳) روایت مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

(۴) ارواحِ ثلاثہ، ص ۵۲، ۵۳

https://telegram.me/ilmokiab

محبتِ رسولﷺ

شاہ صاحبؒ کے دل میں نبی کریمﷺ کی غیر معمولی محبت و عظمت تھی۔ ان کو ذاتِ رسالت مآب سے جو یگانگت و تعلق تھا اس کا اندازہ شاہ صاحبؒ کے ترجمۂ قرآن اور موضحِ قرآن سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ محبتِ رسولﷺ ہی کا اثر تھا کہ اہل سادات کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ حالاں کہ بڑے بڑے رؤسا کو بھی وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک رئیس جو اہلِ تشیع میں سے تھا، شاہ صاحبؒ کے پاس آیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی تعظیم و تکریم کی۔ اس نے کہا کہ آپ میری تعظیم و تکریم کیوں فرماتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ تمہارے سید ہونے کی وجہ سے۔ اس نے کہا کہ میں تو شیعی ہوں۔ جواب میں شاہ صاحب نے کہا کہ کیا مضائقہ۔ سید اگر شیعی ہوتا ہے تو میں اس کی بھی تعظیم کرتا ہوں۔ قرآن لکھنے میں کاتب اگر غلطی کر جائے تو پھر بھی اس کو قرآن ہی کہیں گے۔ اگر چہ اس کا اظہار بھی کر دیں کہ اس میں غلطیاں ہیں۔

اس سے وہ رئیس اتنا متاثر ہوا کہ اس نے شیعہ مسلک ترک کر دیا۔ اس کے ساتھ جو شیعہ حضرات تھے وہ بھی اپنا مسلک ترک کر کے اہل سنت میں داخل ہو گئے۔(۱)

تواضع

کمال علم و فضل کے باوجود شاہ صاحبؒ نہایت متواضع المزاج تھے۔ مسجد اکبر آبادی جس میں شاہ صاحبؒ رہتے تھے اس کے دونوں طرف بازار تھا۔ مسجد کے دونوں طرف حجرے اور شہ دریاں تھیں۔ اپنے حجرے سے باہر شہ دری میں ایک پتھر لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ نہ قیمتی مسند کا اہتمام تھا نہ کسی اور چیز کا۔ انھوں نے ایک بوریہ نشین فقیر کی زندگی اختیار کی تھی۔ بازار کے آنے جانے والوں کا سلام قبول فرماتے تھے۔(۲) حقیقت یہ ہے کہ جن کے پاس علم و عرفان کا سرمایہ ہوتا ہے وہ ظاہری نمود و نمائش اور شان و شوکت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ، ص ۵۴

(۲) ایضاً ص، ۵۵

https://telegram.me/ilmokiab

کے لحاظ سے کوئی بلند نہیں ہوتے اُنہیں ظاہری چیزوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حالاں کہ اس سے کبھی بھی وہ خلا پر نہیں ہو پاتا جو ان کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے۔

رعب و ہیبت

شاہ صاحبؒ کی شخصیت نہایت باوقار تھی، خدا نے انہیں ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے رؤسا بھی شاہ صاحب کی خدمت میں آتے تو مرعوب ہو جاتے تھے۔ ادب کی وجہ سے وہ دور بیٹھتے اور خاموش رہتے اور بغیر شاہ صاحبؒ کی تحریک کے ان کو مجالِ سخن نہ تھی۔ اور ضرورت سے زیادہ اُنہیں فضول گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔(۱)

ایک مرتبہ ایک بخاری بزرگ شاہ صاحبؒ کے پاس تشریف لائے، اور ہیبت زدہ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ جب وہ واپس ہوئے تو امام جامع مسجد نے جن کے ساتھ وہ شاہ صاحب کے پاس آئے تھے، شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے کہا کہ اُن کی حالت بیان کرنے سے میں اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں۔ جب میں نے مسجد اکبر آبادی کی سیڑھیوں پر قدم رکھا تو جو کچھ میرے پاس تھا، سلب ہو گیا اور میں کورا رہ گیا اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک میں واپس نہیں ہو گیا۔(۲) درحقیقت شاہ صاحبؒ کی محض موجودگی وہ اثر رکھتی تھی کہ بڑے بڑوں کو ان کے پاس پہنچ کر اپنی بے بضاعتی کا احساس اپنے آپ ہونے لگتا تھا۔

قرآن مجید سے شغف

شاہ صاحبؒ کو قرآن سے قلبی ربط و تعلق تھا۔ قرآن سے ان کے شغف کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مسجد اکبر آبادی میں چالیس سال تک خاص طور سے قرآن ہی کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہے۔ قرآن سے ان کا خاص تعلق ان کے ترجمہ قرآن سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ان کے گہرے فکر و تدبر اور قلبی یافتوں کا ترجمان ہے۔ شاہ صاحب مسجد اکبر آبادی

---

(۱) آثار الصنادید، ص ۵۴۶، ۵۴۷

(۲) ارواحِ ثلاثہ، ص ۱۴۴، ۱۴۵

https://telegram.me/ilmokiab

میں چند سال نہیں چالیس سال تک بالکل ایک معتکف کے انداز میں قیام پذیر رہے۔ سوائے قرآن پڑھنے پڑھانے کے ان کا کوئی اور شغل نہیں تھا۔(۱) شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے ان کے قرآن پڑھنے کی بے حد تعریف فرمائی ہے۔(۲)

معقولات سے عدمِ دلچسپی

حقیقی علم نے شاہ صاحبؒ کو فلسفہ و منطق سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ ایک فطری بات ہے، جس کو قرآن نے حکمت و روشنی عطا کی ہو وہ کسی ایسی چیز کے سہارے نہیں جیتا جو محض ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہو، جس کی حیثیت محض دور کی خبر کی ہوتی ہے، جس میں آدمی کے بہترین اور لطیف جذبات و احساسات اور وجدانی قوتوں کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاہ صاحب فلسفہ و منطق سے نابلد تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا فضلِ حق اور مفتی صدر الدین آزردہ کے استاد مولانا فضل امام خیر آبادی نے شاہ صاحب کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مجسطی ہر کوئی مدرس پڑھا سکتا ہے، لیکن شاہ صاحب اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے حکیم بطلیموس صاحب مجسطی پڑھاتا۔(۳)

فلسفہ و منطق میں گہرا دخل رکھنے کے باوجود حکمتِ قرآن نے شاہ صاحبؒ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کا بہ خوبی اندازہ شاہ صاحب کے اپنے لکھے ہوئے قرآن کے حواشی یعنی موضح قرآن سے ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس زمانہ میں عام اہل علم کے افکار و نظریات پر یونانی فلسفہ کا اثر غالب تھا، اس زمانہ میں شاہ صاحبؒ کی تحریر اس کے اثرات سے بالکل پاک رہی۔ اسے ان کی سلامتیِ طبع اور قرآن کریم کا فیض واثر کا کرشمہ ہی کہا جائے گا۔

معقولات سے شاہ صاحبؒ کی عدم دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک بزرگ یہاں تک فرماتے تھے کہ اس خاندان میں دو غبی ہیں۔ ایک شاہ عبد القادر اور ایک مولانا اسحاق

---

(۱) حکیم الاسلام اور ان کی مجلس، ص ۷۵

(۲) ملفوظات عزیزیہ، ص ۱۵۴

(۳) مشاہیر جنگ آزادی، از مفتی انتظام اللہ شہابی، ص ۹۳

https://telegram.me/ilmokiab

صاحب، مولانا فضلِ حق اور مفتی صدر الدین صاحب بھی کہنے لگے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ جیسے تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ سب جانتے ہیں، لیکن معقولات نہیں جانتے۔ ایک روز جب یہ دونوں حضرات شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا، کچھ معقولیوں کی خرافات پر گفتگو ہو۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ متکلمین کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جو فلاسفہ کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہے؟ انھوں نے کہا کہ متکلمین کے اکثر مسائل کمزور ہیں، مگر فلاں مسئلہ تو نہایت ہی کمزور ہے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا: "اچھا تم فلاسفہ کا مسئلہ لو اور ہم متکلمین کا مسئلہ لیتے ہیں۔ آؤ گفتگو کریں۔" گفتگو ہوئی تو شاہ صاحب نے دونوں کو عاجز کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: اب یہ بتاؤ کہ فلاسفہ کے یہاں کون سا مسئلہ تمہارے نزدیک کمزور ہے۔ انھوں نے ایک مسئلہ کی نشان دہی کی۔

شاہ صاحبؒ نے کہا اچھا اب تم متکلمین کا پہلو لو اور ہم فلاسفہ کا۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا لیکن شاہ صاحب کے مقابلے میں وہ نہ چل سکے۔ ہر طرح سے مغلوب ہو کر رہے اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔"

بعض حضرات کے نزدیک اس گفتگو میں مولانا فضل حق صاحب شریک نہ تھے۔(۱)

لوگوں کی تعلیم و تربیت

شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے جن اشخاص نے استفادہ کیا ان میں شیخ عبدالحیؒ بہیۃ اللہ بڑھانوی، اسماعیل شہید، شیخ فضل حق بن فضل امام خیر آبادی، مرزا حسن علی شافعی، اور شاہ محمد اسحاق کے علاوہ کتنے علمائے کبار و مشائخ شامل ہیں۔(۲)

عام استفادہ کی غرض سے بھی کتنے ہی لوگ شاہ صاحب کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے، اس سلسلے میں شاہ احمد سعید صاحب اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں شاہ صاحبؒ کی خدمت

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ، ص ۵۰، ۵۱

(۲) انوار الباری، دوم ص ۲۰۵

https://telegram.me/ilmokiab

میں حاضر ہوا کرتا تھا، کبھی زیارت کے لیے اور کبھی برائے استفادہ۔(۱)

لوگوں کو دین کی طرف لانے کے لیے شاہ صاحبؒ تقریر بھی کرتے تھے۔ کسی شخص کو نصیحت کرنی ہوتی تو اس کو تنہائی میں بڑی شفقت و محبت سے نصیحت کرتے اور اس میں اس کا خیال کرتے کہ اس کو خفت و ندامت نہ ہو۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے آ کر وضو کیا۔ نوجوانوں کی جیسی عادت ہوتی ہے اس نے جلدی جلدی وضو کیا۔ اس کی ایڑیاں خشک رہ گئیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس نوجوان کو بلایا۔ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے اس کے اوپر ہاتھ رکھ کر فرمایا: بیٹا! میں ضعیف ہو گیا ہوں بعض اوقات وضو کرتا ہوں تو مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میری ایڑی خشک رہ گئی ہے۔ اگر کہیں وہ خشک رہ گئی تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ایڑی جہنم میں جلے گی۔ میں وضو کر کے آیا ہوں ذرا دیکھو تو میری ایڑی خشک تو نہیں رہ گئی ہے۔ نوجوان سمجھ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی ایڑی کیوں خشک رہے گی، یہ میری غلطی ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی وضو میں بے احتیاطی سے کام نہ لوں گا۔(۲) اسی طرح ایک مرتبہ ایک ایسے شخص کو نصیحت فرمائی جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے پہنچا ہوا تھا۔(۳)

گناہ میں ملوث لوگوں کے ساتھ بھی شاہ صاحبؒ نہایت اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بھنگ فروش عورت آپ کے پاس آئی۔ اس کے ساتھ بھی شاہ صاحب نہایت اخلاق سے پیش آئے اور اس کی ضرورت پوری کی۔(۴)

غیر مسلموں سے ربط و تعلق

شاہ صاحب کی خدمت میں مسلمانوں کے علاوہ کبھی کبھی غیر مسلم بھی آ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ چار جوگی آئے۔ شاہ صاحب نے انہیں بوریوں پر بٹھایا اور خود بھی بوریہ پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور ان کی تواضع کی۔(۵) تذکرہ نگاروں نے یہ نقل نہیں کیا کہ شاہ صاحب کی ان جوگیوں

---

(۱) مقاماتِ خیر

(۲) مجالس حسنہ، قاری محمد طیب صاحبؒ، ص ۷۵

(۳) ارواحِ ثلاثہ، ص ۵۶، ۵۷

(۴) ایضاً، ص ۵۲، ۵۳ (۵) ایضاً

https://telegram.me/ilmokiab

سے کیا بات چیت ہوئی۔ ورنہ اس گفتگو کو میں یہاں ضرور نقل کرتا۔ غیر مسلموں تک حق کا پیغام پہنچانا ایک اہم ذمہ داری ہے، جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ ذمہ داری جتنی بڑی ہے اتنی زیادہ اس کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے۔ غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا کام ہی دراصل وہ پیمانہ ہے، جس سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم کتنے زندہ ہیں اور اسلام سے ہماری وابستگی کس درجہ کی ہے۔

فہم وبصیرت

شاہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے خاص فہم وبصیرت سے نوازا تھا۔ اس کا ثبوت دینی مسائل میں ان کی آراء ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے عام معاملات سے بھی ملتا ہے۔ یہاں اس سلسلے کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں مسجد اکبر آبادی سے جب جوتے زیادہ چوری جانے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے جوتے چوروں کے لیے حلال کردیا کرو۔ پھر وہ نہیں لیں گے(۱)

اس سے جہاں شاہ صاحب کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کسی مقصد کے لیے تدبیر وہ اختیار کرتے تھے جو نہایت پاکیزہ ہو اور اس سے آدمی کی تربیت بھی ہوسکے۔ فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کو انسانی کردار میں اہم بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ چوروں کے لیے اپنی چیز حلال کردو۔ اس میں در پردہ فیاضی کی جو تعلیم پائی جاتی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ، مولانا اسمٰعیل شہید سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انہیں اپنا بیٹا بھی بنالیا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے جب اپنی جائداد اپنی بیٹی اور اپنے بھائیوں کی جانب سے منتقل کی تو بیٹی اور بھائیوں سے اجازت لے کر کچھ حصہ ان کے نام کردیا(۲) شاہ صاحبؒ کو اس کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی انھوں نے اپنی بیٹی اور بھائیوں سے اس کی اجازت لی۔

اجازت لینے کی بات شاہ صاحبؒ کے ذہن میں آئی یہ اُن کی بصیرت اور دوراندیشی کی

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ، ص ۱۰۳
(۲) ایضاً، ص ۵۲، ۵۳

https://telegram.me/ilmokiab

واضح دلیل ہے۔اصل میں جائداد میں سے کسی کو کچھ حصہ دینے سے بالعموم ورثاء کو شکایت ہو جاتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعزہ میں باہم خوش گوار تعلق باقی نہیں رہتا۔اس طرح سے جس کو جائداد میں کچھ حصہ دے دیا جاتا ہے اس کے سلسلے میں ورثاء کے دلوں میں خواہ مخواہ کے لیے ایک کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔شاہ صاحبؒ نے بڑی خوبی سے اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے نماز میں رفع یدین شروع کیا تو بعض لوگوں کی شکایت پر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے فرمایا کہ اسمٰعیل کو سمجھا دینا کہ وہ رفع یدین نہ کیا کریں کیوں کہ اس سے خواہ مخواہ کے لیے عوام میں شورش ہوگی۔شاہ صاحبؒ نے مولانا محمد یعقوب صاحب کے ذریعے سے کہلایا تو مولانا اسمٰعیل صاحب نے کہا کہ اگر عوام کے فتنے کا خیال کیا جائے تو پھر اس کے معنی کیا ہوں گے: من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید (جو امت میں بگاڑ پیدا ہونے کے وقت میری کسی سنت کو اختیار کرے گا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا) جب کوئی سنت متروکہ اختیار کرے گا تو عوام میں شورش تو ہوگی ہی۔شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے ان کا یہ جواب سنا تو فرمایا:

> ''بابا ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمٰعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھتا۔یہ حکم تو اس وقت کا ہے جب کہ سنت کے مقابل غیر سنت پر عمل ہو۔''(۱)

اس سلسلے کا ایک واقعہ اور ملاحظہ ہو۔ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا کہ عبدالقادر! اسحاق کی طرف بھی توجہ کرنا۔اس کے جواب میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

> ''اسحاق کو ضرورت نہیں۔وہ بلا ذکر و شغل بوجہ دینی ریاضت کرنے کے ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے جو باقاعدہ سلوک طے کرتے ہیں۔''

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے چند مرتبہ توجہ دینے کے لیے کہا۔لیکن ہر بار شاہ صاحبؒ یہی جواب دیتے رہے، آخر میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا تھا:

> ''عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو۔''(۲)

---

(۱) ارواح ثلاثہ،ص ۹۵

(۲) ایضاً،ص ۱۲۴

https://telegram.me/ilmokiab

اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ دوسرے کی حالت و کیفیت کا اپنی بصیرت سے بہ خوبی اندازہ فرما لیتے تھے۔ وہیں اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک اصل مسئلہ مقام احسان کا حصول ہے۔ اشغال صوفیاء کا اختیار کرنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی کو مقام احسان حاصل ہو تو اسے صوفیاء کے اشغال و اعمال کی طرف بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ فیصلہ اس شخصیت کا ہے جس نے طریق صوفیا پر تصوف کے مراحل طے کیے تھے اور بزرگوں سے باقاعدہ تصوف کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آج کتنے ہی لوگوں کے یہاں صوفیانہ اشغال نے ایسی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ وہ یہ بھول ہی گئے ہیں کہ سلوک وتصوف کی اصل غرض وغایت کیا ہے۔ حقیقت کا مقام کچھ ظاہری اشغال واعمال نے حاصل کر لیا ہے۔ حقیقت و کیفیت کے مقابلہ میں اوراد و وظائف کی مقدار اور رسوم محض کو اصل وزن دیا جانے لگا ہے۔

علمی کارنامہ

شاہ عبد القادر صاحبؒ نے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ انھوں نے صرف قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کے مختصر حواشی اردو زبان میں لکھے۔ لیکن ان کا تنہا یہی کام دوسروں کے بیسیوں تصنیفی کاموں پر بھاری ہے۔ شاہ عبد القادر صاحب نے خواب دیکھا کہ قرآن مجید ان پر نازل ہوا ہے۔ اس خواب کی تعبیر ان کے بڑے بھائی شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے یہ بیان کی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں قرآن کی خدمت کی ایسی توفیق بخشیں گے جس کی نظیر پہلے نہ ہوگی(۱)

شاہ صاحبؒ کا یہ خواب صحیح ثابت ہوا۔ شاہ صاحب نے قرآن پاک کا بول چال کی زبان میں ایسا ترجمہ فرمایا جس کی خوبیوں کا اعتراف سب ہی کو ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ نہایت سیدھا سادہ ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ صحیح معنوں میں وہی کر سکتا ہے، جس کو ادب اور علم تفسیر و حدیث سے وافر حصہ ملا ہو، جس کو تفسیر کے سلسلے میں دشواریوں کا صحیح اندازہ ہو، جسے اس کا پتہ ہو کہ قرآن کے بعض مضرات کی شرح میں کیسی کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ ترجمہ میں بعض اوقات ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ وہ ذہن و دماغ کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ الہامی

---

(۱) انوار الباری دوم، ص ۲۰۵، بہ حوالہ مہر جہانتاب

https://telegram.me/ilmokiab

محسوس ہوتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے قرآن کا ترجمہ محض لفظی نہیں کیا، کیوں کہ اس طرح ترجمہ کا اصل مقصد حاصل نہ ہوتا۔ اس سلسلہ میں دیباچہ میں وہ خود فرماتے ہیں:

''ترکیب ہندی، ترکیب عربی سے بہت بعید ہے اگر بعینہٖ وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔''

اس ترجمے سے کیا فائدہ جو مقصد کے حصول میں مددگار نہ ہو۔ عربی عبارت کے اردو یا ہندی ترجمے میں اسلوب اور ترکیب عربی کی نہیں اردو یا ہندی ہی کی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کے بغیر ترجمے کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

شاہ صاحبؒ نے پہلے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا تھا، لیکن بعد میں لوگوں کی خواہش پر کچھ حواشی بھی تحریر فرمائے۔ چناں چہ خود تحریر فرماتے ہیں:

''اوّل ترجمہ قرآن ہوا تھا۔ بعد اس کے لوگوں نے خواہش کی تو بعض فوائد بھی متعلق تفسیر داخل کیے۔ اس فائدے کے امتیاز کو صرف ''ف'' نشان رکھا۔''

لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا نام موضح قرآن ہے اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ یعنی ۱۲۰۵ھ اور اس وقت ۱۷۹۰ء تھا۔''

شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن شروع ہی سے لوگوں میں مقبول رہا ہے۔ شاہ عبداللہ ابوالخیرؒ کو شاہ صاحب کا ترجمہ بے حد پسند تھا۔ شاہ احمد سعیدؒ اور ان کے صاحب زادوں اور ان کے برادر محدث شاہ عبدالغنیؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ بھی اس ترجمے کو پسند کرتے تھے(۱) اور ان کے کمال باطن کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں شاہ صاحبؒ کے ترجمے کے متعلق لکھا ہے:

''ان کا ترجمہ کلام اللہ کا، اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے۔''(۲)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے شاگردوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کا ترجمہ دیکھو

(۱) بہ روایت مولانا زید ابوالحسن صاحب فاروقی مجددی

(۲) آثار الصنادید، ص ۳۶۲

https://telegram.me/ilmokiab

اور بعض مسائل جو تفسیر سے حل نہیں ہوتے وہ اس ترجمے سے حل ہو جاتے ہیں[۱]

خود علامہ انور شاہ صاحب نے ایک بار رمضان المبارک کا پورا مہینہ شاہ صاحبؒ کے موضح قرآن کے مطالعہ اور اس پر غور وفکر میں گزارا[۲]

مولانا حیدر حسن خاں صاحب[۳] فرماتے تھے کہ مولانا مظہر نانوتویؒ[۴] تفسیر پڑھانے کے بعد سب سے آخر میں شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھاتے تھے[۵]

ان چند مثالوں سے شاہ صاحبؒ کے اس عظیم کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اولاد

شاہ صاحبؒ کے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی شادی شاہ صاحب نے اپنے بھتیجے مولوی مصطفیٰ صاحب سے کی تھی۔ ان سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جو مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی زوجیت میں آئی۔ اس سے مولوی محمد عمر پیدا ہوئے[۶]

انتقال

شاہ صاحبؒ نے ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں بہ عمر ۶۳ سال وفات پائی اور اپنے جد امجد شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کے پائیں میں دفن ہوئے[۷]

☆☆

---

(۱) مقدمہ ترجمۂ قرآن، از مولانا احمد علی صاحب

(۲) محاسن موضح قرآن (بہ حوالہ جزاء الاحسان، از پروفیسر عبد الکریم لاہوری)

(۳) مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کے استاذ

(۴) بانی مظاہر العلوم سہارن پور

(۵) بہ روایت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ

(۶) مجموعۂ کمالاتِ عزیزی، ص ۳۶

(۷) سیر المصنفین، از محمد یحییٰ بی-اے تنہا

https://telegram.me/ilmokiab

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی قرآن فہمی

موضح قرآن کی روشنی میں

شاہ عبدالقادر صاحبؒ (متوفی ۱۲۳۰ھ) نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔ یہ ترجمہ مختلف پہلوؤں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ترجمہ کی زبان نہایت آسان اور عام فہم ہے، جن لوگوں نے اس ترجمہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ یہ ترجمہ سہل ممتنع کی اپنی مثال آپ ہے، اس کے علاوہ اس ترجمہ میں عجیب کیف واثر پایا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے محض ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے ایک ایک آیت کی روح تک اترنے کی کوشش کی ہے، پھر اس سے جو اثر ان کے دل میں پیدا ہوا ہے اسے بھی اپنے ترجمے کے ذریعے سے محفوظ کر دینے کی سعی فرمائی ہے۔ ان کی یہ کوشش تصنع وتکلف سے یکسر پاک ہے۔ تصنع اور تکلف سے تحریر یا تقریر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ صداقت جہاں پائی جاتی ہے وہاں فطری طور پر سادگی آجاتی ہے۔

شاہ صاحب کے ترجمہ کے محاسن پر الگ سے ان شاء اللہ پھر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں ہم شاہ صاحبؒ کے ایک دوسرے کارنامے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ قرآن کے علاوہ مختلف تفسیر حواشی لکھے ہیں۔ یہ حواشی بھی بیش قیمت ہیں۔ حواشی کی زبان بھی سادہ اور دل کش ہے۔ حواشی کے اکثر مختصر فقرے اتنے جامع ہیں کہ ان میں بہت سے پھیلے ہوئے مضامین کو بڑی فنکاری اور کمالِ حکمت کے ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے۔ اگر ان میں فکر وتدبر سے کام لیا

https://telegram.me/ilmokiab

جائے تو کتنے ہی علمی گوشے سامنے آسکتے ہیں، جو شاہ صاحب کے ذہنی کمال اور بیداریِ دل کا پتہ دیں گے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ شاہ صاحب خطا اور غلطی سے یکسر مبرا ہیں، لیکن اس سے ان کی عظمت میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ غلطی اور خطا بڑے سے بڑے دانا اور عالم سے بھی ہوتی ہے۔ دیکھنے کی چیز آدمی کی سلامت روی اور صحیح فکر و نظر اور وہ جذبہ ہے جس کے تحت وہ کوئی کام انجام دیتا ہے۔

شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے حواشی کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنی علم و حکمت کیا ہے، اور وہ کس درجہ تصنع اور اختراعی طریق استدلال سے پاک ہے؟ قرآن کس طرح کے طریق استدلال سے ہمیں آشنا کرنا چاہتا ہے؟ شاہ صاحب علم کلام اور منطق سے ناآشنا نہ تھے، بلکہ انہیں اس میں پورا درک حاصل تھا۔ لیکن یہ چیز قرآنی فلسفہ و حکمت کے سمجھنے میں ان کے لیے مانع نہ ہوسکی۔ یہی شاہ صاحب کا کمال ہے۔ یہ ان کی سلامتیِ طبع ہے کہ وہ قرآن کی آیات کی تشریح و توضیح کرتے ہیں تو اسے یونانی افکار اور اختراعی طریق استدلال کے اثرات سے بالکل محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ قرآن کے فطری دلائل کو نہایت فطری سادگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے ذہن اور دل کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے، بلکہ ہماری روح کو پاکیزہ غذا بھی میسر آتی ہے اور قرآنی حکمت اور دانائی کا سرا ہمارے ہاتھ آجاتا ہے۔ ہمیں صحیح طرزِ فکر اور سوچنے کا وہ ڈھنگ اور طریقہ معلوم ہوجاتا ہے، جو قرآن ہمیں عطا کرنا چاہتا ہے۔ اس سے حقائق اس طرح منکشف ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے محض خبر نہیں ہوتے بلکہ ایسی محسوس صداقت بن جاتے ہیں جن کی تردید اس کے بغیر ممکن نہیں رہتی کہ آدمی خود اپنی فطرت اور کائنات سے صرف نظر کرلے یا بے جا ہٹ دھرمی سے کام لے۔

افسوس کہ لوگوں نے شاہ صاحب کے طریقے کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ان کے اندازِ فکر کی اہمیت کو محسوس نہ کرسکے اور ان کے کام کو آگے بڑھایا نہ جاسکا۔

اب ہم شاہ صاحب کے حواشیِ قرآن کے بعض اہم مقامات کو پیش کرکے یہ دکھانا چاہیں گے کہ موصوف کا یہ کارنامہ کتنا بیش قیمت اور گوناگوں فوائد کا حامل ہے۔ ہم شاہ صاحبؒ کے منتخب حواشی مختلف عنوانات کے تحت ایک خاص ترتیب سے پیش کریں گے۔ ہم نے جو عنوانات مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں:

https://telegram.me/ilmokiab

[۱] خدا کی ہستی ہی اصل ہے۔ [۲] اصل معاملہ خدا کی ذات سے ہے۔ [۳] شرک [۴] اصل دین [۵] وحدتِ دین [۶] آسان دین [۷] دین فطرت۔ [۸] معقول روش۔ [۹] منکرین کا اصل مرض [۱۰] مماثلت [۱۱] پیغمبر کی حیثیت، حکمت، قرآن کی قسمیں، [۱۴] تخلیق کائنات عبث نہیں [۱۵] خدا کی سنت [۱۶] کائنات کی گواہی [۱۷] تاریخ کیا کہتی ہے؟ [۱۸] انفس کی شہادت۔ [۱۹] نظریۂ آخرت۔ [۲۰] آواگون کی تردید [۲۱] حقائق [۲۲] نفسیاتی حقائق۔ [۲۳] نگاہ حقیقت شناس۔ [۲۴] موت کیا ہے؟ [۲۵] حساس دل کی یافت [۲۶] مشاہدہ ومطالعہ۔ [۲۷] زمانہ کی حقیقت۔ [۲۸] تقدیر کا مسئلہ۔ [۲۹] لطیف استدلال۔ [۳۰] لطیف استنباط۔ [۳۱] امثال۔ بعض [۳۲] اہم مقامات۔

(۱) خدا کی ہستی ہی اصل ہے

(۱) اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور:۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں اہل تفسیر نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ زیادہ تر تحریریں ایسی ہیں جن کا آیت کی اصل سے دور کا تعلق نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک ضخیم کتاب بھی میری نظر سے گزری ہے، جس میں دنیا بھر کی معلومات فراہم کی گئی ہیں، لیکن اس میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ مل سکا جس کو اس آیت کی تفسیر کہا جا سکے۔ اس آیت نور کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے سادے انداز میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ایسا ہے کہ جسے ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ اور اہلِ فکر ونظر کے لیے بھی اس میں سرمایہ تسکین ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''یعنی اللہ سے رونق اور بستی ہے زمین اور آسمان کی۔ اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں۔''

جو راز ہے اسے راز ہی رہنا چاہیے اور راز ہی رہے گا۔ ہماری کاوشیں راز سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہی ثابت ہوں گی۔ پھر زندگی میں کوئی راز باقی نہ رہے تو زندگی کا لطف ہی کیا رہ جائے گا۔ جاننے کی اصل بات یہ ہے کہ زندگی اور کائنات کا راز کوئی معمولی راز نہیں ہے۔ وہ توحد

https://telegram.me/ilmokiab

درجہ عظیم اور وجد آفریں ہے اس لیے کہ وہ خدا کا راز ہے۔ ساری رونق اور آبادی کا سبب وہی ہے، اس کے بغیر ویرانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہ سکتا۔ لفظ ''نور'' میں ان دونوں ہی حقیقتوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کائنات کی آبادی بھی اللہ ہی کے سبب سے ہے اور اس کی رونق اور زیبائش بھی اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس سے زیادہ خدا کی ذات وصفات اور کائنات سے اس کے تعلق کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے اور اگر اس سلسلہ میں کوئی کاوش کرے بھی تو اس سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔ خدا کی کنہہ کو پانا انسان کی قدرت میں نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ انسان حقیقت کا احاطہ کر سکے۔ انسان کی فکر و کاوش سے راز ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ بڑھتا اور بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو سائنس کی دنیا نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ جیمز جین نے مرنے سے پہلے ایک بیان دیا تھا جس میں اس نے کہا ہے: ''میں نے کھوج کی میں نے جان لیا اور میں نے پایا کہ راز بڑا ہوتا جاتا ہے۔'' پھر کیوں نہ پہلے ہی قدم پر خدا کی عظمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیں۔ شاہ صاحب نے جو بات کہنی تھی سیدھے سادے انداز میں کہہ دی اور وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ ان کا بے جا خامہ فرسائی سے اجتناب لائق تحسین ہے۔ بے جا کاوش آدمی کو قرآن سے دور کرتی اور فکری الجھنوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے سوا اس کا کچھ حاصل نظر نہیں آتا۔

(۲) اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا ۙ۝ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا ۝

(الفرقان: ۴۵، ۴۶)

''کیا تو نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ کیسا لمبا کیا ہے سایہ اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل کیا۔ پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔''

ان آیتوں میں قرآن نے خدا کی ایک خاص نشانی کا ذکر کیا ہے، اس نشانی کا تعلق سورج اور سایہ سے ہے۔ سایہ شروع میں لمبا اور دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، اور وہ سورج کے تابع ہوتا ہے۔ آفتاب جتنا بلند ہوتا جاتا ہے سایہ سمٹتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر میں جب آفتاب سر پر آجاتا ہے تو ہر چیز کا سایہ اس کی طرف سمٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ قدرت کا یہ منظر ہم دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا اس میں کسی بڑی حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے؟ دنیا کی کون سی چیز ہے جس سے

https://telegram.me/ilmokiab

حقیقت کی نشان دہی نہ ہوتی ہو؟ قرآن ہمیں وہ نگاہ عطا کرنا چاہتا ہے کہ ہر شے ہمارے لیے خدا کی نشانی بن جائے۔ صاحب نظر کے لیے یہ دھوپ چھاؤں محض دھوپ چھاؤں کا کھیل نہیں ہے بلکہ کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح اس سے بھی ایک بڑی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''سایہ ہٹتا ہے جب تک کہ جڑ میں آ لگے۔ اپنی طرف کھینچ لیا یہ کہ اپنی اصل کو جا لگتا ہے۔ سب کی اصل اللہ ہے۔''

شاہ صاحب نے وضاحت فرمادی۔ سایہ کھینچ کر آخر میں اپنی اصل میں آ لگتا ہے، لیکن یہ محض سورج اور سایہ کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے کسی اور کی قدرت کارفرما ہے۔ وہی سایہ کو پھیلاتا اور بالآخر وہی کھینچ لیتا ہے۔ جس طرح ہر سایہ کی ایک اصل ہوتی ہے خواہ وہ کوئی درخت ہو یا ٹیلہ ہو۔ بالآخر سایہ اسی کی طرف سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سب کی اصل اللہ ہے۔ ہر حرکت و عمل کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے، ہم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ کوئی اصل سے بے نیاز کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی چھاؤں یا سایہ اپنی اصل سے الگ ہو کر نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ اس سے الگ ہو کر کہیں جا سکتا ہے۔ وہ کتنا دراز ہو جائے اپنی اصل سے جڑا ہوتا ہے اور سمٹتا ہے تو اپنی اصل ہی کی طرف سمٹتا ہے۔ اس کا پھیلنا اور سمٹنا سورج کی رہبری میں ایک ضابطہ اور قانون کے تحت ہوتا ہے۔ انسان کو بھی چاہیے کہ وہ خدا کی ہستی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اسی نے دنیا میں ہمیں بھیجا اور اسی کی طرف انجام کار سب کو پلٹ کر جانا ہے۔

ہر چیز کی اصل اللہ کی ذات ہے۔ یہ بات اس آیت میں سیدھے طریقے سے واضح انداز میں نہیں کہی گئی ہے، بلکہ نکتہ زا (Suggestive) انداز میں کہی گئی ہے۔ کنایت اور ایمائیت کی وجہ سے اثر بڑھ گیا ہے۔ درخت یا کسی چیز کا سایہ اپنی جڑ سے جا لگتا ہے، یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں۔ قرآن اس کے ساتھ اس کے آگے کی حقیقت کو ملا دیتا ہے، جو بالعموم لوگوں کو نظر نہیں آتی اور جس کے سمجھنے سے لوگ عام طور سے قاصر رہ جاتے ہیں، اور وہی ہے، جسے شاہ صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''سب کی اصل اللہ ہے۔'' قرآن میں سمٹتے ہوئے سایہ کے بارے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

https://telegram.me/ilmokiab

ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَيْنَا قَبْضاً يَّسِيْراً ○

"پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔"

یہ بات اسی وقت صحیح ثابت ہو سکتی ہے جب کہ سب کی اصل خدا کو مانا جائے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ○ (سبا:۱)

"حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے۔ وہ دانا اور باخبر ہے۔"

ہم جہاں کہیں کوئی حسن و خوبی دیکھتے ہیں اس کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے، اور اگر کوئی ہم پر احسان کرتا ہے اور ہم اس کی تعریف کرتے ہیں تو یہ تعریف و ستائش محض تعریف و ستائش نہیں ہوتی بلکہ اپنے محسن کا شکر بھی ہوتا ہے۔ بنیادی لحاظ سے ہم کسی سے ان ہی دو پہلوؤں سے جڑتے اور رشتہ قائم کرتے ہیں۔ کوئی بھی ہو اس سے ہمارا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، اگر اس میں کوئی خوبی اور خوب صورتی پائی جاتی ہے ہم اس کی تعریف کریں گے۔ یہ تعریف اس کی خوبیوں کا اعتراف ہے۔ اور اگر کوئی ہم پر احسانات کرتا ہے تو اس کی خوبیاں ہمارے لیے محض خوبیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جن سے ہم مستفیض ہو رہے ہوتے ہیں وہ منظورِ نظر ہی نہیں ہمارا محسن بھی ہوتا ہے۔ اب اس کی تعریف، تعریف کے علاوہ جذبہ شکر کا اظہار بھی ہے۔

اس آیت میں انسانوں کے سامنے ایک بڑی حقیقت واضح الفاظ میں بیان ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ساری خوبیاں درحقیقت خدا کی ہیں۔ یہ زمین و آسمان اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ کائنات کا خالق حسن و خوبی سے متصف ہے۔ اگر اس میں خوبیاں نہ ہوتیں تو کائنات میں ان کا اظہار کیسے ہو سکتا تھا۔ عالم آخرت میں بھی جو حسن و خوبی اور خیر سامنے آئے گا وہ بھی خدا ہی کی طرف سے ہوگا۔ البتہ چوں کہ آخرت میں غیب کا پردہ باقی نہ رہے گا، اس لیے حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی۔ آج جس چیز کو ہم دلائل سے مانتے ہیں وہ ایک زندہ حقیقت کی طرف ہمارے سامنے ہوگی۔ وہاں ہر شے میں انسان کو خدا کی کارفرمائی دکھائی دے گی۔ آج تو ہم کسی کے اندر کوئی خوبی دیکھ کر اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں اور اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

https://telegram.me/ilmokiab

حالاں کہ جب بھی ہم کسی کو قابل تعریف سمجھتے ہیں تو اس سے پہلے خدا تعریف کا مستحق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حسن وخوبی جہاں کہیں اور جس شکل میں بھی ہو وہ خدا کی خوبیوں ہی کا پرتو اور عکس ہے۔ اب شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اس آیت کی تشریح میں رقم فرمائے ہیں:

''دنیا میں ظاہر اور کسی کی بھی تعریف ہوتی ہے کہ وہ پردہ ہے اللہ کے فعل کا۔ آخرت میں پردہ نہیں جو ہے سو اسی کی طرف سے ہے۔''

مختصر الفاظ میں کس طرح ایک بڑے اور وسیع مضمون کو بیان کیا گیا ہے، یہ شاہ صاحب کے قلم کا اعجاز ہے۔

(۴) قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيْمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ (الحجرات:۱۷)

''ان سے کہو، اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ تمھیں ایمان کی ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مومنانہ طرزِ عمل کیا ہے؟ اگر نیکی کی توفیق ہمیں حاصل ہو تو اس کے نتیجے میں کسی طرح کا بھی کبر ہمارے اندر نہیں پیدا ہونا چاہیے، اور نہ ہم اسے اپنا کوئی کمال سمجھیں، بلکہ ایسے موقع پر ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرمائی۔ اگر کوئی عمل قابل تعریف ہے تو اس میں اصل تعریف خدا کی ہے، جس نے اپنے عمل کا موقع اور اس کے کرنے کی طاقت اور صلاحیت مرحمت فرمائی۔ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں:

''جو نیکی اپنے ہاتھ سے ہوا پنی تعریف نہیں، رب کی تعریف ہے، جس نے کروائی۔''

۲-اصل معاملہ خدا کی ذات سے ہے

(۱) وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الشوریٰ:۲۵)

''اور وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

https://telegram.me/ilmokiab

ہماری نگاہ اتنی تیز ہونی چاہیے کہ وہ ہر پردہ سے گزر کر اصل حقیقت کو دیکھ سکے اگر ایسا ہوتو دنیا کی زندگی ہی میں آدمی اس سچائی سے آشنا ہو جائے کہ خدا کی ہستی ہی اصل ہے۔ اصل معاملہ خدا کی ذات سے ہے۔ ہماری بھلائی اور زندگی کی کامیابی جس خدا سے وابستہ ہے اس سے باخبر ہونا کس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ ہمارے کاموں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ بندہ سے اگر غلطی اور خطا ہوتی ہے اور اس سے تائب ہو کر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا کا دامن رحمت کشادہ ہے۔ وہ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ وہ اہل ایمان کی دعائیں سنتا اور انہیں اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منکروں کے لیے اس کے یہاں سخت عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نبی اور اس کے داعی پیروؤں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں تک پیغام حق پہنچا دیں۔ اس کے بعد یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے قبول کرتے ہیں یا اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ جو بھی رویہ اختیار کرتے ہیں خدا اس سے غافل نہیں رہ سکتا۔ وہ علیم اور خبیر ہے وہ لوگوں کو ان کے نیک اعمال کی جزا یا اُن کے کفر و انکار کی سزا دے گا۔ آدمی کا جس خدا سے معاملہ ہے وہ خدا نہ تو عاجز ہے کہ کوئی شخص غلط روش اختیار کر کے اس کے منصوبے کو ناکام کر سکے اور نہ خدا قدر ناشناس ہے کہ وہ اپنے نیک اور طاعت گزار بندوں کو فراموش کر دے۔ شاہ صاحب اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

”نبی پیغام پہنچاتا ہے اور بندوں کو سب معاملات اپنے رب سے ہے۔“

(۲) قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (الحجرات:١٦)

”کہو، کیا تم اللہ کو اپنی دین داری جتاتے ہو اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز جانتا ہے۔“

اس آیت میں ایک بڑی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ آدمی اگر اسلام پر عمل کرتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ کسی پر احسان نہیں کر رہا ہے۔ ایمان اور اسلام کی دولت اگر ہمیں حاصل ہے تو یہ خدا کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ اگر اس کی

https://telegram.me/ilmokiab

توفیق شامل حال نہ ہوتی تو کبھی بھی کسی کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ دین کے کاموں میں ریا یا نام و نمود کی خواہش درست نہیں۔ آدمی ریا کر کے دکھاتا کس کو ہے۔ اپنے کارناموں کو سناتا کس کو ہے، جس خدا سے اصل معاملہ ہے اور جس کی رضا اور خوش نودی کے لیے سارے کام کرنے چاہئیں وہ خدا تو بے خبر نہیں ہے۔ اس لیے نام و نمود کی خواہش اور ہر طرح کی نمائش سے بچتے ہوئے آدمی کو خالص خدا کی رضا کے لیے کام کرنا چاہیے۔ شاہ صاحب نے اس آیت کے تحت کتنا صحیح لکھا ہے۔

''اگر سچا دین تم کو ہے تو کہے سے کیا ہوگا۔ جس سے معاملت ہے وہ آپ خبردار ہے۔''

لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو زندگی میں ہمیشہ اس حقیقت کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوں۔

۳۔ شرک

اِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً ۢبَعِيْدًا۝ (النساء:۱۱۶)

''اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کا شریک ٹھہرائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے بخشتا ہے اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

آیت کے پس منظر کو نگاہ میں رکھیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں شرک سے مراد خدا کے ساتھ دوسرے معبودوں کی محض پرستش یا پوجا نہیں ہے، بلکہ زندگی میں جو مقام خدا کا ہے وہ مقام کسی دوسرے کے لیے تسلیم کرنا بھی اسی طرح شرک ہے، جس طرح خدا کے علاوہ دوسرے کی پرستش کرنی شرک ہے۔ یہ کتنی بڑی غلط فہمی یا قرآن سے بے خبری ہے کہ آدمی خدا کو صرف اپنے جذبۂ عبودیت کے اظہار کے لیے معبود تسلیم کرے اور زندگی کے دوسرے معاملات میں اپنے آپ کو آزاد تصور کر کے اپنی خواہشات یا دوسروں کی مرضیات کی پیروی کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھنے لگے، خواہ وہ دوسرا مارکس، لینن یا کوئی بھی ہو۔ خدا کی مرضی کے علی الرغم اگر ہم کسی دوسرے کی مرضی یا نظریات کو پسند کرتے یا اختیار کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے تصورِ الٰہ کو تسلیم نہیں کیا اور خدا کا جو تصور ہم رکھتے ہیں وہ حد درجہ ناقص ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا کی ساری ہدایات بے سود

https://telegram.me/ilmokiab

اور بے معنیٰ یا محض تاریخی ریکارڈ ہیں۔ اس سے زیادہ زندگی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ قرآنی نظم کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوئے اور جدا راہ چلے۔ یہ آیت فرماتی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے۔ پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگر چہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔''

وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (الحج:۳۱)

''اور جو اللہ کا شریک کرے گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر پرندے اسے اچک لے جاتے ہیں یا ہوا اسے کسی دور جگہ پھینک دیتی ہے۔''

شرک انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان کی فطرت دین کے معاملے میں انتشار پسند ہرگز نہیں ہے۔ انسان کو ایک ہی دل ملا ہے جو پورے طور پر ایک کا ہونا چاہتا ہے۔ اس میں اس کے لیے لطف و راحت اور تسکین کا سامان ہے۔ خود جذبۂ محبت اور جذبۂ عبودیت کو یہ گوارا نہیں کہ وہ مختلف معبودوں اور حبیبوں میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ لیکن مختلف اسباب کے تحت آدمی جب شرک کی روش اپناتا ہے تو اس کے اس نازک ترین جذبے کو چوٹ پہنچتی ہے۔ اس لیے کبھی بھی اسے وہ طمانیت اور سکون نہیں مل سکتا جو ایک خدا کی پرستش اور بندگی میں مل سکتا ہے۔ پھر خدا پرستی انسان کو جس بلندی پر فائز کرتی ہے، اس بلندی سے بھی وہ محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بلندی سے گرتا ہے تو اس کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ خدا پرستی کا دامن چھوٹتے ہی بہ آسانی وہ ہر موقع پرست کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ اس کی اپنی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پرستش ہی کے ذریعے سے آدمی کی شخصیت اور وقار کی حفاظت ہوتی ہے۔ شرک کی روش اختیار کرنے کے بعد تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اس سے بڑھ کر ذلیل اور خوار کوئی نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو اس آیت میں ایک تمثیل کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے مشرک شخص کی ہلاکت، پستی اور خواری کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

https://telegram.me/ilmokiab

"جوکوئی شرک کرے اس کی مثال فرمائی۔ اس واسطے کہ جس کی نیت ایک اللہ پر ہے وہ قائم ہے اور جہاں نیت بہت طرف گئی وہ سب اس کو راہ میں سے اچک لے گئے یا سب سے منکر ہوکر دہریہ ہوگیا۔"

یعنی وہ زندگی کے اصل راستے سے بھٹک گیا۔ وہ صرف یہی نہیں کہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا وہ حقیقی زندگی سے بھی محروم ہوکر رہ جاتا ہے۔

(۴) اصل دین

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ○ (الانعام:۱۶۰)

"اور جنہوں نے اپنے دین میں جدا جدا راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہوگئے تمہیں ان سے کچھ کام نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہ انہیں جتادے گا جو کچھ وہ کرتے تھے۔"

اس آیت کے ضمن میں شاہ صاحبؒ نے ایک بنیادی اصول بیان فرمایا ہے:

"دین میں جو باتیں یقین لانے کی ہیں ان میں فرق نہ چاہیے اور جو کرنی ہیں اس کے طریقے کئی ہوں تو برا نہیں۔"

یقین لانے کی جو باتیں ہوتی ہیں وہی اصل دین ہیں۔ دین میں فرق کبھی نہیں رہا ہے۔ ہر نبی نے ایک ہی دین کی تعلیم دی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی نبی نے ایک دین کی طرف بلایا اور دوسرے نے کسی دوسرے دین کی طرف دعوت دی ہو۔ دین سب کا مشترک رہا ہے۔ ایمانیات اور عقائد سب کے مشترک رہے ہیں۔ سب نے ایک خدا کی بندگی کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور اس پر زور دیا کہ لوگ اپنے نبی کا اتباع کریں۔ سب ہی نے آخرت کی جزا و سزا سے لوگوں کو باخبر کیا۔ کچھ فرق اگر رہا ہے تو شرعی احکام کے ضابطوں اور طریقوں میں رہا ہے، اور ایسا حالات اور مواقع کے لحاظ سے ہوا ہے۔ اس کے باوجود سب کی شریعتوں کی روح اور مزاج ایک رہا ہے۔ سبھی شریعتیں مبنی بر انصاف رہی ہیں۔ آج بھی شرعی احکام میں علمائے اسلام کے مابین اختلاف ممکن ہے، اور اختلافات پائے بھی جاتے ہیں، لیکن ان اختلافات کی بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دین میں فرق واقع ہوگیا۔ سبھی ایک دین کے پیرو اور خدا کے طاعت گزار ہیں۔ اور

https://telegram.me/ilmokiab

سارے ہی اہلِ اسلام بھائی بھائی اور ایک نبی کی امت ہیں۔ جو لوگ کسی فروعی اختلافات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو لعن طعن کا نشانہ بناتے ہیں، وہ حقیقت میں اصل دین اور عملی طریقوں کے باہمی فرق کو نہیں سمجھتے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی بنا پر سخت نقصان پہنچا ہے اور آئندہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی اصل دین اور اس کی اصل اسپرٹ سے نا آشنا رہ جاتا ہے۔

(۴) فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ (الروم:۳۰)

”تو سیدھا رکھو اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہو کر۔ وہی اللہ کی ڈالی ہوئی بنا جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کے بنائے کو نہ بدلنا، یہی سیدھا دین ہے، مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ سب رجوع ہو کر اس کی طرف اور اس کا ڈر رکھو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں مت ہو۔“

شاہ صاحب نے یہاں ایک بڑی گہری بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آدمی بظاہر دین کا ہی کام کیوں نہ کرے، لیکن اگر اس کام میں انابت الی اللہ کا جذبہ نہیں پایا جاتا، اور اگر رجوع الی اللہ اس کے عمل کی اصل روح نہیں بن سکی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی اس کا یہ کام دین نہیں بن سکا ہے۔ یہ صورتِ حال اصلاح طلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یعنی اصل دین پکڑو اس کی طرف رجوع ہو کر۔ اگر صلاح دنیا کے واسطے یہ کام کیے تو دین درست نہ ہوا۔“

دین کی اصل غرض وغایت صلاح دنیا یا دنیا کی تعمیر نہیں ہے، بلکہ دین اصل میں خدا کی طرف رجوع ہونے کا نام ہے، اور یہ رجوع کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ آدمی یہ جان سکے کہ رجوع الی اللہ بہ ذاتِ خود قدر کا حامل اور بذاتِ خود مطلوب ومقصود ہے۔ اس سلسلے میں جو دنیوی فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ ایمان وعمل کی اصل غرض وغایت نہیں ہیں۔ دین کی اصل روح تو خدا سے وابستگی اور ہر معاملے میں اپنے کو اسی کی خوشی کے تابع رکھنا ہے۔

https://telegram.me/ilmokiab

(۵) وحدتِ دین

(۱) كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (البقرۃ:۲۱۳)

''لوگوں کا دین ایک ہے۔ پھر اللہ نے نبی بھیجے، خوش خبری دیتے اور ڈر سناتے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل فرمائی کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلاف کا فیصلہ کرے اور کتاب میں اختلاف اُنہیں نے پیدا کیا جن کو وہ ملی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن نشانیاں پہنچ چکی تھیں۔ ایسا انھوں نے آپس کی ضد سے کیا۔''

انسان کے لیے دین ایک ہی ہونا چاہیے۔ دین وہی ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت پر قائم ہو۔ انسانی فطرت ہمیشہ سے ایک رہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوسکی۔ اس حقیقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو قرآن کا یہ دعویٰ کتنا بامعنیٰ ہے کہ انسان کے لیے جو دین مقرر ہوا وہ ایک ہی ہے۔ حقیقت میں سارے ہی انسان ایک ہی گروہ ہیں۔ انسان کے لیے جو دین مقرر ہوا وہ وہی ہے جس کی طرف قرآن راہ نمائی کرتا ہے۔ دین میں فرق اور اختلاف اگر نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خدا نے انسانوں کے لیے مختلف ادیان نازل کیے، بلکہ یہ افتراق کی صورتِ حال درحقیقت دینِ حق سے برگشتہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتی۔ دینِ حق سے برگشتہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ خدا نے تو اس سلسلے میں ہمیشہ صاف احکام اور واضح ہدایات نازل فرمائیں، لیکن جب دین کو لوگ خدا کے ساتھ اپنا ذاتی معاملہ نہ سمجھیں بلکہ اصل اہمیت آپس کی ضد اور بغض وعناد کو دیں تو اس کا انجام وہی ہونا چاہیے جو ہوا کہ لوگ مختلف راہوں پر چل پڑے۔ اور ایک دوسرے کے مخالف ادیان وجود میں آگئے۔ آج بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خدا کی جانب سے دین کو واضح شکل میں اور دلائل و براہین اور واضح شکل و ہدایات کے ساتھ نازل ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ خدا کی کتاب محفوظ شکل میں قرآن کی شکل میں موجود ہے پھر بھی اہل زمین ایک دین پر متفق نظر نہیں آتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ

https://telegram.me/ilmokiab

یہ تو نہیں ہو سکتی کہ دین مبہم اور مشتبہ ہے۔ بلکہ یہ اسی پرانے مرض کی کرشمہ سازی ہے، جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے کہ لوگ واضح راہ پانے کے بعد بھی محض ضد اور ظلم و زیادتی کے سبب سے دین میں اختلاف و افتراق پیدا کرتے ہیں۔ دین ایک ہے اور ہمیشہ اصل دین ایک رہا ہے۔ شرعی احکام اور شریعتوں میں جو فرق رہا ہے وہ اس سلسلے قابلِ لحاظ نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اللہ کے ہاں سے سب خلق کو ایک ہی راہ کا حکم ہے..... سب نبی اور سب کتابیں اسی ایک راہ کو قائم کرنے آئے ہیں۔ اس کی مثال جیسے تندرستی ایک ہے اور مرض بے شمار۔ جب ایک مرض پیدا ہوا ایک دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا۔ جب دوسری بیماری پیدا ہوتی دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا۔ اب آخری کتاب میں ایسی راہ فرمائی کہ ہر مرض سے بچاؤ ہے۔ یہ سب کے بدلے کفایت ہوتی۔''

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ○ (الحج:٦٧)

''ہر امت کے لیے ہم نے ایک راہِ بندگی ٹھہرادی، وہ اس پر چلے تو وہ ہرگز اس معاملہ میں تم سے نہ جھگڑیں اور اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ بے شک تم سیدھی راہ پر ہو۔''

مختلف شرائع میں جو فرق رہا ہے اس کی بنیاد پر اصل دین کے معاملہ میں اختلاف اور جھگڑا کرنا صریحاً نادانی ہے۔ آج اگر کوئی کہے کہ قرآن میں جو شرعی احکام اور عبادت کے طریقے بیان ہوتے ہیں ان کی تائید و تصدیق کے لیے اگلے نبیوں کی شریعتوں سے دلائل فراہم کرو، تو سراسر یہ زیادتی ہوگی۔ دین تو تمام انبیا کا ایک ہی رہا ہے۔ شرعی احکام میں تغیر اور تبدیلی مختلف مصالح اور اسباب کے تحت ہوتی رہی ہے۔ پھر شریعتوں کی تنسیخ بھی عام معنیٰ میں نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ یہ ایک ناگزیر بات تھی کہ شریعت کو ارتقائی مراحل سے گزرنے کا موقع دیا جائے، اور اتنی گنجائش اب بھی رکھی گئی ہے کہ حالات کی تبدیلی کے سبب جب ہم کسی نئی صورتِ حال سے دوچار ہوں تو شرعی اصولوں کی روشنی میں ایسے قوانین و ضوابط وضع کر سکتے ہیں جو بہ ظاہر جدید معلوم ہوں گے، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے وہ دین و شریعت سے بالکل ہم آہنگ ہوں گے۔ اسی لیے دین

https://telegram.me/ilmokiab

میں اجتہاد کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بہر حال شرعی اختلاف ایسی چیز نہیں ہے جسے بہانہ بنا کر کوئی شخص دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ مختلف شرائع میں اگر بہ ظاہر اختلاف دکھائی دیتا ہے تو یہ اہل نظر کے لیے باعث نزاع ہرگز نہیں ہوسکتا۔ شاہ صاحبؒ اس آیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''یعنی اصل دین ہمیشہ سے ایک ہے اور احکام ہر دین میں جدا آتے ہیں۔ ہر حکم کا واسطہ کیوں پوچھتے ہیں۔''

یعنی یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر حکم کے ماخذ (Reference) کا مطالبہ کیا کہ اس کی نشاندہی اگلی شریعتوں میں کی جائے۔ جس چیز میں فطری طور پر اختلاف پایا جاتا ہے، اسے تو لوگ دیکھتے ہیں لیکن جس چیز میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ ذہن وفکر کی کوئی صحت مند علامت ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

(۳) وَ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ○ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ○ (المومنون: ۵۲، ۵۳)

''اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں تمہارا رب ہوں، تو مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کر کے جدا جدا کر دیا۔ جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے۔''

قرآن کی اطلاع کے مطابق سارے انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا ہے، اور ان کے پیرو ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام رسولوں نے ہر چیز میں پاکیزگی، تقویٰ اور عمل صالح کی تعلیم دی ہے۔ مختلف قوموں میں الگ الگ جو بگاڑ یا خرابیاں پائی جاتی تھیں، ان کے دور کرنے کے لیے جو احکام دیے گئے فطری بات ہے کہ ان احکام و ہدایات میں بھی خرابیوں کے فرق کے لحاظ سے فرق ہونا چاہیے تھا، اور اس کو ملحوظ رکھا گیا، لیکن لوگوں کی کوتاہ نظری کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے کو بالکل الگ سمجھنے لگے اور انسانیت الگ الگ گروہوں کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ حالاں کہ کچھ ظاہری فرق کی بنیاد پر انسانیت کو مختلف امتوں میں بانٹ دینے اور ایک کو دوسرے سے بالکل مختلف قرار دینے کی دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ ظاہر کے لحاظ سے جو الگ

https://telegram.me/ilmokiab

الگ دین دکھائی دے سکتے تھے اب اس کی بھی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیوں کہ خدا نے آخر میں اپنا رسول اور اپنی کتاب قرآن بھیج کر ساری خرابیوں اور بگاڑ کے علاج سے ایک ساتھ باخبر کر دیا ہے، اور اب اس پہلو سے بھی دین ایک ہو گیا ہے۔ ساری تعلیمات قرآن میں جمع ہو گئی ہیں اس میں دس احکام (Ten Commandments) ہی نہیں وہ سارے ہی احکام آ گئے ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس بات کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

''ہر پیغمبر کے ہاتھ اللہ نے جو اس وقت کے لوگوں میں بگاڑ تھا اس کا سنوار فرمایا ہے۔ پیچھے لوگوں نے جانا ان کا حکم جدا جدا ہے۔ آخر ہمارے پیغمبر کے ہاتھ سب بگاڑ کا سنوار اکٹھا بتا دیا۔ اب سب دین مل کر ایک ہو گیا۔''

یعنی اب کوئی جواز اس کے لیے باقی نہیں ہے کہ آدمی مختلف ادیان کے پیچھے سرگرداں و پریشان ہو اور وحدت ادیان کے دل فریب نظریہ کی ترویج میں جان کھپائے جب کہ ان مختلف مذاہب میں طرح طرح کی چیزیں لوگوں نے اپنی طرف سے بھی جوڑ دی ہیں۔ اور کتنی ہی باتوں کو اپنی خواہشات کے سبب بدل ڈالا ہے۔

(۴) اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ○ (محمد:۱،۲)

''جو لوگ منکر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکا، اللہ نے ان کے عمل برباد کر دیے اور جو ایمان لائے اور بھلے کام کیے اور اُسے مانا جو محمدؐ پر اُترا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ اللہ نے ان سے ان کی برائیاں اُتار دیں اور ان کی حالت سنوار دی۔''

ان آیتوں سے یہ ظاہر ہے کہ حق اور سچا دین وہی ہے جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ اب خدا کی مرضی یہ ہے کہ لوگ خدا کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے جو حق پیش کیا گیا ہے یکسو ہو کر اس کی پیروی کریں۔ ایک تو خالص حق اور خدا کی مرضیات کو جاننے کا کوئی دوسرا مستند ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے، دوسرے اب خدا نے ساری انسانیت کے پیش نظر قیامت تک

https://telegram.me/ilmokiab

کے لیے جو شریعت نازل کی ہے وہ اتنی جامع اور مکمل ہے کہ وہ سارے ہی انسانوں اور آنے والے ہر دور کے لیے کافی ہے۔ اب اگر اس کی کوئی مخالفت کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے نہ تو خدا کی مرضی کا پاس ہے اور نہ اسے حق و ناحق کا کوئی خیال ہے۔ اس سے پہلے دنیا کے لوگوں کو اس کا مکلف نہیں قرار دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی نبی کی لائی ہوئی تعلیمات کی پیروی کریں۔ مختلف قوموں کی ہدایات کے لیے خدا نے مختلف انبیاء اور رسول بھیجے لیکن اب وہ صورتِ حال نہیں ہے۔ اب تو اگر انسان سعادت دارین حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کو اختیار کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر اس کا کوئی عمل خدا کے یہاں قبول نہیں ہوگا۔ یہی سیدھی سچی بات ہے جو ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ ان آیتوں کی تشریح میں بیان فرماتے ہیں:

> ''پہلے زمانے میں سب خلق کو تکلیف نہ تھی ایک شرع کی۔ اس وقت سب جہان کو ایک حکم ہے۔ اب سچا دین یہی ہے۔ اور کام بھلے برے مسلمان بھی کرتے ہیں اور کافر بھی، لیکن سچا دین ماننے کو یہ قبولیت ہے کہ نیکی ثابت اور برائی معاف اور نہ ماننے کی یہ سزا ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم۔''

(۶) آسان دین

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (المائدۃ: ۱۰۰، ۱۰۱)

> ''کہہ دو ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں، اگرچہ ناپاک چیزوں کی کثرت تمھیں بھا جائے، تو اللہ سے ڈرو اے عقل مندو! شاید تمھارا بھلا ہو۔ اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔ اور اگر انھیں اس وقت پوچھو گے جب کہ قرآن اُتر رہا ہو تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ خدا نے ایسی باتوں سے درگزر فرمایا ہے، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔''

https://telegram.me/ilmokiab

ان آیتوں سے دین کی ایک بڑی خوبی ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہ دین انسان کو کسی مصیبت میں مبتلا کرنے کے لیے نہیں اُترا ہے۔ بلکہ یہ نہایت آسان اور فطری دین ہے۔ یہ بندے کا اس کے اپنے خدا سے رشتہ قائم کرتا اور زندگی کو آسان اور پاکیزہ تر بناتا ہے۔ دین کے نازل کیے جانے کی غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان کو مبتلائے عذاب رکھا جائے۔ اس دین میں ضروری ہدایات سب دے دی ہیں۔ جن باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کا ذکر نہیں فرمایا ہے۔ ان میں انسانوں کے لیے آزادی رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر مناسب رویہ اختیار کریں۔ اگر ایک ایک بات کے لیے متعین حکم آ جاتا تو انسان کے لیے دائرۂ فکر و عمل میں کشادگی باقی نہ رہتی جو آج پائی جاتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بھی زیادہ سوال کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ شارع کی طرف سے متعین بات یا طریقہ بتا دیے جانے کے بعد لازماً اسے اختیار کرنا پڑتا۔ بصورتِ دیگر اس سلسلے میں مختلف طریقے ممکن ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ جن معاملات میں کوئی واضح بات شارع کی طرف سے نہیں بتائی گئی ہیں۔ ان میں مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ کسی نے کسی پہلو کو اختیار کیا ہے۔ کسی نے کسی دوسرے پہلو کو ترجیح دی ہے۔ اس طرح کا اختلاف در حقیقت دین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ دین کی آسانی کشادگی اور فراخی ہے۔ اس سے دین کا دائرہ حد درجہ وسیع اور کشادہ ہو گیا ہے، اور دین پر عمل کرنا بھی مشکل نہیں رہا۔ شاہ صاحبؒ اس راز کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر سے سوال نہ کیا کرو۔ اس سے تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''یعنی آپؐ سے نہ پوچھو کہ یہ چیز روا ہے یا نہیں۔ یہ کام کریں یا نہ کریں بلکہ جو فرمایا اس پر عمل کرو، جو نہ فرمایا اس کو معاف جانو۔ اس میں دین آسان رہے اور جو ہر بات کا جواب آوے تو دین تنگ ہو جاوے۔ پھر عمل نہ کر سکو جیسے اگلے نہ کر سکے۔''

(۷) دینِ فطرت

(۱) هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَ لَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ٥ (التوبۃ:۳۳)

https://telegram.me/ilmokiab

''اسی نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے ہر دین سے اوپر کرے، اگر چہ مشرک برا ہی مانیں۔''

اس آیت کے ضمن میں شاہ صاحب نے دینِ حق کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ رسولؐ خدا کے ذریعے سے جو ہدایت اور دینِ حق اُترا ہے اسے سب پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، یہ برتری ہر پہلو سے ہے۔ خدا کو اظہارِ دین ہر پہلو سے کرنا تھا۔ عقل اور انسانی فطرت اس سے بہتر و برتر دین کا تصور نہیں کرسکتی۔ اس دین میں قربِ خداوندی کی جو رعایت رکھی گئی ہے وہ عدد درجہ مکمل ہے۔ اس میں کسی پہلو سے کوئی نقص اور کمی نہیں پائی جاتی۔ اس دین کی اصل روح ہی خدا کا قرب ہے۔ اسی لیے اس میں ہر فکر و عمل کو اسی بنیادی حقیقت سے وابستہ رکھا گیا ہے۔ اس دین سے بے پروائی کو جہالت، نادانی اور محرومی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''یہ دین سب سے اوپر ہے، عقل کے نزدیک اور خدا کے نزدیک یعنی جو اس سے قرب ملے اللہ کا، سوا اور سے نہیں۔''

(۲) اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ (ہود:۵۶)

''بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔''

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے:

''یعنی جو سیدھی راہ چلے وہ اس سے ملے۔''

شاہ صاحبؒ نے تین بنیادی حقیقتوں کو ایک فقرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اولاً: اس دین کا اصل محور و مرکز خدا کی ذات ہے۔ اس کی طرف بڑھنا ہی ہماری تمام تر آرزوؤں اور تمناؤں اور کوششوں کا حاصل ہونا چاہیے۔ ثانیاً: ہمارا رب کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جو مبنی برحق اور درست نہ ہو جس کے اندر حسن اور خوبی نہ پائی جاتی ہو۔ ثالثاً: انسان اگر خدا کو پا سکتا ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ وہ خدا کے ساتھ مخالفانہ رویہ ترک کر کے اس کے ساتھ موافق روش اختیار کرے۔ نظامِ کائنات یا زمین و آسمان کی دنیا اگر قائم ہے تو خدا کے ساتھ موافق رویہ سے ہی قائم ہے۔ اس کی مخالفت پر نظامِ کائنات چل ہی نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی کامیابی کا بھی

https://telegram.me/ilmokiab

سارا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان بھی اسی فطری اور درست طریقے کو اپنائے۔ یہی چیز اسے خدا سے ملانے اور اس سے جوڑنے والی ہو سکتی ہے۔

(۳) اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ (ہود: ۱۱۴)

"بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔"

قرآن نے نیکی کے جس وصف کا ذکر کیا ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کا تعلق انسان کو انفرادی زندگی سے لے کر اس کی اجتماعی زندگی تک سے ہے۔ نیکی کے غلبے میں بڑی خیر و برکت ہے۔ نیکیوں سے اولاً: برائیوں کے اثرات زائل ہوتے ہیں جو گناہ ہم کر چکے ہوتے ہیں ان کے اثرات ہمارے ذہن و دل میں موجود ہوتے ہیں۔ نیکیوں میں اس کی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ برائی کے اثرات کو زائل کر سکیں۔

ثانیاً: نیکیوں سے برائیوں اور گناہوں کی عادت اور خو چھوٹتی ہے، اور آدمی کو نیکی اور بھلائی سے رغبت ہو جاتی ہے۔

ثالثاً: اگر ملک یا سماج میں نیکی کو فروغ اور غلبہ حاصل ہو وہاں سے گمراہی اور برائی خود بہ خود مٹنے لگتی ہے۔ لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ نیکی کا پہلو غالب ہو۔ اگر زندگی میں برائی غالب ہے تو ظاہر ہے نیکی اپنے اثرات کہاں تک دکھا سکتی ہے۔ اب شاہ صاحبؒ کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح۔ جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں، اور جو نیکیاں پکڑے اس سے خو برائیوں کی چھوٹے۔ اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آوے اور گمراہی مٹے، لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیے۔ جتنا میل اُتنا صابون۔"

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً ط فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ ...... وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ○

(الروم: ۳۰-۳۳)

https://telegram.me/ilmokiab

"تو تم سیدھا رکھو اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہوکر۔ یہی اللہ کی ڈالی بنا ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے کو یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ سب رجوع ہوکر اس کی طرف اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو اس کی طرف رجوع ہوکر پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں اپنی طرف سے کچھ رحمت کا مزہ دیتا ہے، تو جبھی ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کا شریک ٹھیرانے لگتے ہیں۔"

شاہ صاحبؒ نے ان آیات کے تحت جو کچھ لکھا ہے وہ بیش قیمت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پیغمبروں کی زبان سے جس دین کی تعلیم دی گئی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ انسانی فطرت کے لیے وہ کوئی اجنبی چیز نہیں ہے۔ خدا کا حاکم اور واحد اور سب سے برتر ہونا ایسی بات ہے، جسے سب جانتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ زندگی میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح لوگوں کے حقوق کو تلف کرنا اور ان کے ناموس کو عیب لگانا سبھی کے نزدیک برا ہے۔ ٹھیک اسی طرح خدا کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، کسی کو دھوکہ نہ دینا سب ہی کے نزدیک بہتر ہے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ جسے ہم بہتر سمجھتے ہیں اس کو زندگی میں اختیار بھی کریں۔

دین کی دعوت کسی اجنبی اور تاریک راہ کی طرف بلانا نہیں ہے۔ دین کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسانوں پر اوپر سے لادی جارہی ہو۔ دین کی بنیاد انسان کی اپنی جبلت پر رکھی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ معروفات اور نیک اعمال ہی کو انسان کی فطرت و جبلت پہچانتی ہو، بلکہ خدا کی طرف مائل ہونا اور اس کے آگے سرافگندہ ہونا بھی انسان کی فطرت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خارجی اثرات کے تحت آدمی اس حقیقت کی طرف سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ لیکن زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان کی اصل جبلت تحت الشعور سے ابھر کر سامنے آجاتی ہے، مگر یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ انسان پھر بھٹک جاتا ہے اور اپنی اصل جبلت کو نظرانداز کرتا ہے۔ جب حالات سخت ہوتے ہیں اور انسان انتہائی بے چارگی کی حالت میں ہوتا ہے اور کہیں اسے جائے پناہ نظر نہیں آتی تو اسے خدا کی ذات یاد آتی ہے، اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ خدا کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جسے کوئی اپنی مدد کے لیے پکارے۔ ایسی حالت میں وہ خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس کی دعا اور پکار

https://telegram.me/ilmokiab

میں انابت میں حوائگی کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے دامن کو چھوڑ کر خدائے واحد کا سہارا لیتا ہے اور اسی سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک مصائب کے بادل اس کے سر پر چھائے ہوتے ہیں۔ جہاں حالات سازگار ہوئے اور اسے چین واطمینان حاصل ہوا وہ اپنی اصل جبلت اور خدا کو بھول جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ خدا کی عظمت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، بلکہ وہ اتنا غیر سنجیدہ (Unserious) ہو جاتا ہے کہ خدا کی الوہیت اور خداوندی میں دوسروں کو شریک ٹھیرانے میں سرے سے اسے کسی بے انصافی اور قباحت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کبھی خوف اور پریشانی سے گزرا ہے، اور اس وقت ایک خدا کے علاوہ اسے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی فطرت خدا کو پہچانتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے جب انسان خود اپنی جبلت اور اپنی فطرت کی آواز کا دیر تک پاس و لحاظ قائم نہ رکھ سکے۔ شاہ صاحبؒ قرآنی حجت اور دلیل کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

> ''جیسے بھلے کام ہر انسان کی جبلت پہچانتی ہے۔ اللہ کی طرف رجوع ہونا بھی ہر ایک کی جبلت جانتی ہے۔ ڈر کے وقت کھل جاتا ہے (کہ اس کی جبلت کیا ہے)۔''

(۸) معقول روش

(۱) وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَاؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ○

(الاعراف:۲۸)

> ''اور جب کچھ عیب کا کام کریں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ کہو اللہ عیب کے کام کا حکم نہیں دیتا۔ کیا اللہ پر وہ بات لگاتے ہو جس کی تمہیں خبر نہیں۔''

اس سے پہلے حضرت آدم اور ابلیس کا قصہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح آدم کو شیطان نے فریب دے کر بہکایا اور انہیں جنت سے باہر نکلوا دیا۔ اس کے بعد منکرین کی اس روش کا ذکر کیا

https://telegram.me/ilmokiab

گیا ہے کہ وہ اپنی نامناسب اور غلط حرکات پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اور ہمیں خدا نے یہی حکم دیا ہے۔ منکرین در حقیقت خدا پر غلط الزام لگاتے ہیں اور خدا کبھی بھی غلط کاری کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ منکرین اگر سند میں باپ دادا کو پیش کرتے ہیں اور خدا کی تصدیق و تائید کو بھی اس کے ساتھ شامل کرتے ہیں تو ان کی یہ روش ہرگز معقول نہیں ہوسکتی۔ کوئی عمل محض اس لیے صحیح نہیں ہوسکتا کہ وہ باپ دادا کا عمل رہا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ باپ دادا کے طریقے کو خدا کی تصدیق و تائید حاصل ہو۔ شاہ صاحبؒ نے یہاں ایک لطیف استدلال کیا ہے۔ وہ استدلال ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''سن چکے پہلے باپ نے شیطان کا فریب کھایا، پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو؟''

باپ کا طریقہ اگر صحیح ہوسکتا ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ اس کا طریقہ غلط رہا ہو، پھر کسی غلط طریقے کی تائید خدا کیوں کر کرسکتا ہے۔ حضرت آدم کی مثال سامنے ہے۔ ان سے بھی لغزش ہوئی پھر کسی عمل کا محض باپ دادا کا عمل ہونا اس کے صحیح ہونے کی دلیل کیسے ہے۔ معقول روش اگر ہوسکتی ہے تو وہ یہی کہ آدمی سمجھ بوجھ سے کام لے اور حق و ناحق کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ خود فیصلہ کرے۔ خدا نے انسان کو عقل اور فہم اس لیے تو نہیں دیا ہے کہ آدمی سرے سے اس سے کام ہی نہ لے۔

(۲) وَ اِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ○ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَھْدِیْنِ○ (الزخرف:۲۶،۲۷)

''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں الگ ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو، سوائے اس کے جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے ضرور راہ دے گا۔''

نظم کلام کی روشنی میں شاہ صاحبؒ نے یہاں جو استدلال فرمایا ہے وہ نہایت موثر ہے۔ اس آیت سے پہلے منکرین کا یہ قول نقل ہوا ہے:

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِم مُّقْتَدُوْن (الزخرف:۲۳)

''ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے، اور ہم اُن کے نقش قدم پر راہ پائے ہوئے ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیم کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح جب انھوں نے دیکھا کہ ان

https://telegram.me/ilmokiab

کے باپ اور ان کی قوم کے لوگ غلط دین اختیار کیے ہوئے ہیں تو اس سے ہٹ کر جو صحیح راستہ تھا، اسی کو اپنایا۔ نہ اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ان کا فیصلہ قوم کے خلاف پڑ رہا ہے اور نہ یہ دیکھا کہ وہ جو راستہ اپنا رہے ہیں وہ باپ کے طریقے کے بالکل خلاف ہے۔ جب ابراہیم جیسا پیشوا اور امام صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہہ کر غلط روش سے اپنی برأت اور بیزاری ظاہر کرتا ہے تو آخر باپ دادا کا نام لینے والے اور ان کا حوالہ دینے والے حضرت ابراہیم کا طرزِ عمل کیوں نہیں دیکھتے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ صرف یہ کہ انکار کرنے والوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں بلکہ پیشوا اور امام بھی ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

> ”یہاں یہ قصہ اس پر کہا کہ تمہارے پیشوا نے باپ کی راہِ غلط دیکھ کر چھوڑ دی تم بھی وہی کرو۔“

(۳) وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ (الزخرف:۲۰)

> ”اور کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کو نہ پوجتے۔ انہیں اس کی کچھ خبر نہیں۔ یونہی اٹکل دوڑاتے ہیں۔“

اس آیت میں مشرکین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”اگر رحمٰن چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔“ اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ انہیں اس کی خبر نہیں یہ سب محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ یعنی بات صحیح کہہ کر بھی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ یہ خدا کی قدرت میں ہے کہ کوئی ایک شخص بھی شرک نہ کرے لیکن وہ مشرکین کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ شرک کو چھوڑ ہی دیں۔ اگر کوئی شرک سے باز نہیں آتا تو وہ خود اس کا برا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ کسی کام کی چھوٹ اگر خدا کی مشیت دیتی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ چیز بذاتِ خود اچھی بھی ہے اور اس میں خدا کی رضا بھی شامل ہے۔ رضا اور مشیت میں فرق ہے لیکن منکرین کی یہ ایک بڑی گمراہی ہے کہ وہ اپنے کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کہہ کر معاملے کو الجھانے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی اپنی غلط روش کے لیے وجہِ جواز پیدا ہو سکے۔ لیکن اس سے اصل حقیقت نہیں بدل جاتی۔ جرم و گناہ اس سے کارِ ثواب نہیں ہو

https://telegram.me/ilmokiab

جاتا۔ شاہ صاحبؒ منکرین کی جہالت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تو سچ ہے کہ بن چاہے خدا کے کوئی چیز نہیں، پر اس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا۔ اس نے امرت بھی پیدا کی اور زہر بھی۔ زہر کون کھاتا ہے؟''

آدمی زہر بھی تو کھا سکتا ہے۔ خدا جبراً زہر کھانے سے اسے روکے گا نہیں لیکن وہ زہر نہیں کھاتا۔ وہ جانتا ہے کہ زہر کھا کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن جب شرک اور گناہ سے اسے روکا جاتا ہے تو وہ خدا کی مشیت کو بہانا بناتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ خدا اگر اسے جبراً اس سے روک نہیں رہا ہے تو اس کا مطلب یہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جو کچھ کر رہا ہے وہ ٹھیک بھی ہے۔

(۹) منکرین کا اصل مرض

(۱) اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۠ (النور:۵۰)

''کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا دھوکے میں پڑے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کریں گے۔ بلکہ وہی لوگ ظالم ہیں۔''

اس آیت میں منافقوں کی اصل کمزوری بیان ہوئی ہے۔ وہ ایمان لانے کا دعویٰ خواہ کتنا ہی کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی ان کے قلوب ایمان سے آشنا نہیں ہو سکے ہیں۔ انھوں نے نہ تو اللہ اور اس کے رسول کے مقام کو سمجھا ہے اور نہ انہیں اس کی خبر ہے کہ ایمان زندگی کی ایسی نعمت ہے جسے کسی بھی فائدے پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کر سکتا ہے یا انہیں کوئی دھوکہ لگ رہا ہے اور انہیں کوئی شبہ دامن گیر ہے یا ان کا دل ہی مریض ہے۔ انہیں اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ ان کا اصل روگ یہ ہے کہ حرص نے ابھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ جو طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اس میں دنیوی نفع و نقصان کو پہلے دیکھتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہے حالاں کہ حق اس سے بلند تر شے ہے کہ کوئی اسے دنیوی فائدوں کے معیار سے جانچے۔ درحقیقت ابھی حق تک ان کے ذہن اور قلب کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ ایسی حالت میں یہ نہ تو ایمان کی نعمت سے لذت آشنا ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے

https://telegram.me/ilmokiab

قدم حق کے راستے میں بے جھجک اٹھ سکتے ہیں۔ دنیا کی حرص ایک ایسی بیماری ہے کہ اس بیماری کو لے کر اگر کوئی حق کو مان بھی لے پھر بھی حق کا ساتھ دینا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ ان کے اصل مرض کے بارے میں فرماتے ہیں:

''دل میں روگ یہ کہ خدا اور رسول کو سچ مانا لیکن حرص نہیں چھوڑتی کہ کہے پر چلیں جیسے بیمار چاہتا ہے چلے اور پاؤں نہیں اٹھتا۔''

(۱۰) مماثلت

(۱) فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (یونس:۹۸)

''تو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لائی تو اس کا ایمان اس کے کام آتا۔ ہاں یونس کی قوم کہ جب ایمان لائی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک مدت تک انہیں بہرہ مند رکھا۔''

حضرت محمد ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی میں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی پیغمبرانہ زندگی میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بات قرآن کے گہرے مطالعہ سے اچھی طرح سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے مخالفین نے آپ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو دوسرے انبیاء کے ساتھ اُن کی قوموں کا رویہ رہا ہے۔ آپ کے مخالفین کے بیشتر کے اعتراضات وہی ہیں جو اس سے پہلے منکروں نے اپنے نبیوں پر کیے تھے۔ آپ کی پیغمبرانہ زندگی اور دوسرے انبیاء کی پیغمبرانہ زندگی میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس پر باقاعدہ ایک کتاب تصنیف کی جا سکتی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لا کر تباہی اور ہلاکت سے بچ گئی تھی، حالاں کہ خدا کا عذاب سر پر آ گیا تھا۔ اسی طرح نبی ﷺ کی قوم بھی ایمان لا کر تباہی سے بچی ہے، حالاں کہ فتح مکہ کے موقع پر اسلامی فوج انہیں تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس مماثلت کی طرف عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا۔ لیکن یہ شاہ صاحبؒ کی نگاہ ہے کہ انھوں نے اس کا ذکر واضح انداز میں کیا

https://telegram.me/ilmokiab

ہے وہ فرماتے ہیں:

”دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں آیا مگر قوم یونس (علیہ السلام) کو اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب کا نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی شتابی سے صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی۔ وہ ایمان لائے، پھر بچ گئے۔ اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور امان ملی۔“

(۲) وَ اَنۡجَیۡنَا مُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَہٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ ○ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ○ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ○ (الشعراء: ۶۵-۶۸)

”ہم نے بچا لیا موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کو پھر دوسروں کو ڈبو دیا۔ اس میں ایک نشانی ہے لیکن ان میں اکثر ماننے والے نہیں اور تیرا رب غالب اور مہربان ہے۔“

یہاں فرعون کی غرقابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن خدا کی مدد حضرت موسیٰؑ کے شامل حال رہی۔ فرعون اپنی فوج کے ساتھ پانی میں غرق ہو کر رہ گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنی قوم کے بہ عافیت پار ہو گئے۔

شاہ صاحبؒ تاریخ کے اس اہم واقعہ کی مثال نبی ﷺ کی زندگی میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہ ان کی گہری نظر اور رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ان کی بے پناہ محبت کا کرشمہ ہے۔ واضح رہے کہ سورہ شعراء جس کی آیات ہمارے پیش نظر ہیں مکی سورہ ہے۔ اس سورہ کے نزول کے وقت آپؐ کے دشمن تباہ و برباد نہیں ہوئے تھے۔ یہاں در پردہ آپ کو تسلی دے دی گئی ہے کہ وہ خدا اپنے رسولؐ کے ساتھ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ جس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی تھی وہ خدا آپؐ کی مدد کے لیے کافی ہے۔ قصہ موسیٰؑ و فرعون کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

”یہ سنا دیا ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ مکہ کے فرعون بھی مسلمانوں کے پیچھے نکلیں گے لڑائی کو۔ پھر وطن سے باہر تباہ ہوں گے بدر کے دن، جیسے فرعون تباہ ہوا۔“

https://telegram.me/ilmokiab

(۱۱) پیغمبر کی حیثیت

(۱) قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الانعام:۵۰)

''کہہ دو! میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب کی بات جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو محض اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے۔ کہہ دو! کب برابر ہو سکے اندھا اور بینا۔ کیا تم غور وفکر سے کام نہیں لیتے۔''

اس آیت میں پیغمبر کی حیثیت بیان ہوئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر نہ تو خدائی خزانوں کا مالک ہوتا ہے، اور نہ وہ غیب کی بات جانتا ہے، اور نہ وہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے۔ پیغمبر کی اصل خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس وحی کی پیروی کرتا ہے، جو اس کی طرف خدا کی طرف سے آتی ہے۔ یہ وحی ایسی روشنی ہے جس کے برابر کوئی روشنی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آدمی سورج کے اُجالے میں چل رہا ہو تو اُسے اپنی راہ صاف دکھائی دے گی، وہ کسی گڈھے میں نہیں گر سکتا۔ اسی طرح وحی کی روشنی میں چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا۔ سورج کی روشنی تو انسان کے لیے محض ایک خارجی اور بے شعور روشنی ہوتی ہے، لیکن وحی کی روشنی کی حیثیت روح اور بینائی کی ہوتی ہے۔ قوتِ بینائی کا آدمی سے جو قریبی تعلق ہوتا ہے چراغ یا سورج کی روشنی سے اتنا قریبی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایسی بات ہے جسے ہر خاص و عام سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ دوسروں کو وہ بینائی حاصل نہیں ہوتی جو پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ اگر پیغمبر کو وہ بینائی سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ اندھے ہی رہیں گے۔ اُنہیں حقیقت کی کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔

آدمی اگر مریضانہ ذہنیت کا حامل اور علمی طریق فکر سے ناآشنا ہو تو وہ محض مادّی ساز و سامان کو دیکھے گا اور وہ اسی شخص کا گن گائے گا، جسے دنیوی دولت اور ساز و سامان کا وافر حصہ ملا ہو

https://telegram.me/ilmokiab

یا پھر وہ کسی کی عظمت اور اہمیت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط پیش کرے گا کہ اس میں غیب دانی کی صلاحیت ہو یا اسے فرشتوں کا وصف حاصل ہو جن کو دنیوی ضرورتیں سرے سے پیش ہی نہیں آتیں۔ مریض ذہن ہمیشہ محیر العقول باتوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خرق عادت کا تماشہ دیکھے حالاں کہ ایک پیغمبر دنیا میں اس لیے نہیں آتا کہ وہ لوگوں کو عجوبہ پسندی کی ذہنیت کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔ وہ تو اس لیے آتا ہے کہ لوگ اس کے ذریعے سے حق کا راستہ دیکھ سکیں۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اسے خدا کی طرف سے ایسی بصیرت اور بینائی حاصل ہوتی ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے خلاف عادت اور محیر العقول باتوں کا مطالبہ نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''پیغمبر آدمی کے سوائے کچھ اور نہیں ہو جاتے کہ ان سے محال باتیں طلب کریے۔ ایک اندھے اور دیکھتے کا فرق ہے۔''

(۲) اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلاً ؕ وَ لَوْ اَرٰكَهُمْ كَثِيْراً لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (الانفال:۴۳)

> ''جب اللہ نے تجھے خواب میں منکروں کو تھوڑی تعداد میں دکھایا اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور معاملہ میں جھگڑنے لگتے، لیکن اللہ نے بچالیا۔ بے شک وہ سینوں تک کی باتیں جانتا ہے۔''

یہ جنگ بدر کے سلسلے کی آیت ہے۔ نبی ﷺ کو خواب میں کفار کی تعداد تھوڑی دکھائی گئی تھی۔ جب آپؐ نے صحابہؓ کو خواب سے آگاہ کیا تو ان کی ہمتیں بڑھیں، اور انہیں اپنی کمزوری اور ضعف کا اندیشہ نہ رہا۔ ان میں اس کی جرأت پیدا ہوئی کہ وہ ان سے مقابلہ کر سکیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس خواب کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''پیغمبر کا خواب غلط نہیں۔ ان میں کافر رہنے والے تھوڑے تھے۔ اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے۔''

یوں تو جو لشکر آپؐ کے مقابلہ میں آیا تھا، بہت بڑا تھا، لیکن اس میں کثیر تعداد میں وہ لوگ

https://telegram.me/ilmokiab

شامل تھے جو آگے چل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد نہایت قلیل تھی، جن کے حصے میں ایمان کی دولت نہ تھی۔ ایسے لوگ اس جنگ میں تباہ کر دیے گئے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کا خواب بھی حقیقت کے مطابق ہوتا ہے، اگرچہ بہ ظاہر وہ خلاف واقعہ معلوم ہو رہا ہو۔

(۳) وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ یَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَکُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَۃً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًا ۝ (الفرقان:۲۰)

''اور تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول ہم نے بھیجے، سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ کیا صبر سے کام لیتے ہو؟ اور تیرا رب سب دیکھتا ہے۔''

یعنی کھانا پینا، بازار جانا نبوت کے منافی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ہم نے تمھیں باہم ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے کہ دیکھیں کون ثابت قدم رہتا ہے؟

شاہ صاحبؒ نے یہاں پیغمبر کی ایک اہم حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پیغمبر ہیں کافروں کا ایمان جانچنے کو اور کافر ہیں پیغمبروں کا صبر جانچنے کو۔''

یعنی پیغمبر نہ آئیں تو منکروں کے انکار اور کفر کی جانچ کیسے ہو۔ پیغمبر بھیج کر خدا کھوٹے کو کھرے سے الگ چھانٹ دیتا ہے۔ اسی طرح کافروں کا وجود بھی بے معنی نہیں ہے۔ وہ نہ ہوں تو پیغمبروں اور ان کے پیروؤں کے صبر کا امتحان کیسے ہو سکے۔ کسی میں صبر و ضبط اور استقلال ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کس درجہ کا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اہل باطل حق کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کریں اور اہل حق کو طرح طرح کی تکالیف پہنچانے میں اپنی سرگرمی دکھائیں۔ ایسے ہی مواقع پر کسی کے ایمان و یقین اور سیرت و کردار یا صبر و تحمل اور استقامت کا پتہ چلتا ہے۔ عام حالات میں کوئی دعویٰ کرنا بہت آسان ہے، لیکن ناسازگار حالات اور مصائب میں حق کی صدا بلند کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آدمی کو حق مل گیا ہو اور وہ اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہو۔

(۱۲) حکمت

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ وَ مَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ

https://telegram.me/ilmokiab

لِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ○ (لقمان:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت دی کہ اللہ کا حق مان اور جو کوئی حق مانے گا تو اپنے ہی بھلے کو مانے گا اور جو منکر ہو گا تو اللہ بے پروا اور سزاوارِ حمد ہے۔''

شاہ صاحبؒ نے حکمت کی شرح ان الفاظ میں کی ہے:

''اللہ نے ان کو حکمت دی یعنی عقل کی راہ سے وہ باتیں کھولیں جو موافق ہوں پیغمبروں کے حکم کے۔''

وحی تو پیغمبر ہی کی طرف نازل ہو سکتی ہے، لیکن حکمت سے غیر نبی بھی نوازا جا سکتا ہے۔ حکمت وحی کی مخالف نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحبؒ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت لقمان نے علم و دانش اور ادب و شرافت کی جو باتیں بیان کیں وہ حکمت کے تحت آتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ باتیں وحی و رسالت کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ حضرت لقمان پر یہ باتیں عقل و بصیرت کی راہ سے کھلی تھیں۔ یہ باتیں ان پر کھل گئی تھیں۔ ان کا حق ہونا ان پر پورے طور پر منکشف ہو گیا تھا۔ اسی لیے اسے حکمت سے تعبیر فرمایا۔ اگر ان باتوں کی حیثیت محض گمان اور اندازے کی ہوتی تو پھر ان کو حکمت سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ حکمت کے ساتھ کسی طرح کا تردد یا شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حکیم کی زندگی پاکیزگی اور بلند فکری کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حق کو وہ صرف جانتا ہی نہیں بلکہ وہ اسے پائے ہوئے ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اگر وحی و رسالت کے ذریعے سے ہم تک زندگی کے لیے ہدایات پہنچ چکی ہیں تو حکمت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حکمت کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے۔ جن لوگوں پر خدا کا خاص فضل ہوتا ہے وہ اُنہیں حکمت سے نوازتا ہے۔ اس صورت میں رسالت کے ذریعے سے ملی ہوئی تعلیمات کا حق ہونا ان پر پوری طرح منکشف ہو جاتا ہے۔ پھر اس سلسلے میں انہیں کسی طرح کا شک و شبہ دامن گیر نہیں ہوتا۔ انہیں ایسی بصیرت اور فہم و دانائی مل جاتی ہے کہ نبی کے ذریعے سے پہنچی ہوئی تعلیمات کے مفہوم و منشا کو وہ پوری طرح پا لیتے ہیں اور ان تعلیمات و ہدایات کے حق ہونے میں انہیں کسی طرح کا تردد نہیں ہوتا۔ وہ پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ نبی کی تعلیمات پر چلتے اور دوسروں کو ان کی ترغیب دیتے ہیں۔

https://telegram.me/ilmokiab

(۱۳) قرآن کی قسمیں

وَ الضُّحٰی○ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی○ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی○

(الضحیٰ:۱-۳)

''قسم ہے دن چڑھے کی اور رات کی جب چھا جائے۔ تیرے رب نے نہ تو تجھے چھوڑا اور نہ بیزار ہوا۔''

شاہ صاحبؒ نے ان قسموں کو اس بات کی دلیل مانا ہے کہ خدا بندے سے کبھی دور نہیں ہوتا، پھر وہ برگزیدہ پیغمبر کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں ہی خدا کی قدرت کے نشان ہیں۔ بندہ ان دونوں سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ خدا کی شان وقدرت کے زیر سایہ ہی رہتا ہے۔ بندہ کو روشنی بھی چاہیے اور پرسکون رات کی بھی اسے ضرورت پیش آتی ہے۔ خدا اس کی یہ دونوں ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اس معاملے میں خدا اس کا کفیل و مددگار ہوتا ہے۔ جب عام انسانوں کی ضروریات کا اسے اس درجہ خیال ہے تو کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے رسول کو بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی طرف سے اپنا رُخ موڑ لے۔ خدا کی واضح نشانیاں اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ خدا کبھی اپنے رسول سے بیزار ہوسکتا ہے۔

پھر اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے ایک اور حقیقت کا بھی انکشاف فرمایا ہے وہ یہ کہ جس طرح عالم ظاہر میں خدا کی دو نشانیاں نظر آتی ہیں اسی طرح باطن میں بھی چاندنا ہے اور کبھی اندھیرا۔ اور یہ اندھیرا کوئی منحوس اور وحشت ناک تاریکی نہیں بلکہ روشنی کی طرح وہ بھی ایک ضرورت ہے جو پرسکون اور وجد آفریں ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی جانب سے ہیں۔ بندہ خدا سے نہ اندر سے دور ہوتا ہے اور نہ باہر سے دور ہوتا ہے۔ خدا ہر حالت میں اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ البتہ اس طرح کی دوری ممکن ہے کہ خدا کسی نافرمان شخص سے ناراض ہو جائے لیکن کسی پیغمبر سے وہ کیوں ناراض ہونے لگا جو اس کی اطاعت اور اس کے پیغام کے نشر کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''حضرت (محمد ﷺ) کو کئی دن وحی نہیں آئی، دل مکدر رہا، تہجد کو نہ اٹھے۔ کافروں نے کہا

https://telegram.me/ilmokiab

اس کو چھوڑ دیا اس کے رب نے۔ پھر یہ نازل ہوا۔ پہلے قسم فرمائی دھوپ روشن کی اور رات اندھیری کی۔ یعنی ظاہر میں بھی اللہ کی دو قدرتیں ہیں اور باطن میں کبھی چاندنا ہے کبھی اندھیرا۔ دونوں اللہ کے ہیں۔ اللہ سے دور کبھی نہیں بندہ۔"

(۱۴) تخلیقِ کائنات عبث نہیں

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

"بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بدل بدل کے آنے جانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! تو نے اسے بے کار نہیں بنایا، باعظمت ہے تو، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!"

اگر اس موجودہ عالم کے علاوہ کسی دوسرے عالم کو جس سے مل کر اس عالم کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہو، تسلیم نہ کیا جائے، تو یہ عالم بے معنیٰ اور عبث ٹھیرے گا۔ وقتی فائدہ اور عارضی منفعت سے کسی چیز کے عبث ہونے کا عیب دور نہیں ہوتا۔ جو چیز اس طرح ختم ہو جانے والی ہو کہ اس کا کوئی حقیقی اور دائمی نتیجہ سامنے آنے والا نہ ہو وہ اہل نظر کی نگاہ میں عبث ٹھیرے گا۔ یہ تو فکر کی محض حیوانی سطح ہے کہ کسی کا ذہن عارضی اور زوال پذیر چیز پر اکتفا کرے اور اسی پر راضی ہو جائے۔

کائنات کی تخلیق میں کارفرما حکمت اس بات کی گواہ ہے کہ کائنات کی تخلیق عبث اور بے معنی نہیں ہو سکتی۔ لازماً اس کی کوئی نتیجہ خیز انتہا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ عالم اور اس میں بسنے والے لوگ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور ان کے اچھے برے کاموں کا کوئی حقیقی نتیجہ سامنے نہ آئے۔ اس لیے لازماً اس عالم کی انتہا کسی دوسرے عالم کی شکل میں ہو گی۔ جہاں آدمی اپنے اعمال کے

https://telegram.me/ilmokiab

لحاظ سے سزا یا جزا کا مستحق ہوگا۔ اس کے حصے میں وہی چیز آئے گی جس کا تقاضا اس کے اعمال کر رہے ہوں گے۔ اسی لیے اہل فکر و دانش کو اپنے انجام کی فکر ہوتی ہے اور وہ خدا کے عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل کسی اندھے یقین کے سبب نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے گہری بصیرت اور فکر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا یہ مختصر سا فقرہ کتنا معنیٰ خیز ہے۔

''عبث نہیں بنایا یعنی اس عالم کا انتہا ہے دوسرے عالم میں۔''

اسی موجودہ عالم کو سب کچھ سمجھ بیٹھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ آنے والی دوسری دنیا کی فکر کرنی عین دانش مندی اور ہوش مندی کا تقاضا ہے۔

(۱۵) خدا کی سنت

(۱) ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ (الانفال: ۵۳)

''اس لیے کہ اللہ بدلنے والا نہیں، نعمت جو اس نے دی ہو کسی قوم کو جب تک وہ خود نہ بدلے اپنے جی کی بات، اور یہ کہ اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

اس آیت سے پہلے فرعونیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گناہوں کے سبب خدا کی گرفت میں آ گئے۔ اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا اپنے لطف و احسان اور اپنی بخشی ہوئی نعمت کو تباہی و ہلاکت اور خسران سے نہیں بدلتا، جب تک کہ کوئی قوم خود اُن چیزوں کو نہ بدل ڈالے جو افرادِ قوم کی اپنی ذات کے ساتھ اور ذات میں شامل ہوتی ہیں۔ اس تبدیلی کے بعد خدا کا رویہ بھی ان کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ اس کی رحمت ایسے لوگوں کی طرف سے اپنا رخ موڑ لیتی ہے۔ پھر تباہی و بربادی کے سوا ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔ لیکن جب کسی قوم کی حالت ٹھیک ہوتی ہے اور اس کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ صحیح اور درست ہوتا ہے تو خدا کی نوازش اور نعمت کی بارش اس پر ہوتی رہتی ہے۔ اس آیت میں مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے الفاظ بہت معنیٰ خیز ہیں۔ خدا کی نظر آدمی کی اصل حالت اور کیفیت پر ہوتی ہے۔ وہ اگر درست ہے تو آدمی قابلِ قدر ہے۔

https://telegram.me/ilmokiab

ورنہ اس کا وجود ہی بے معنی ہے۔ معتبر وہ چیز ہوتی ہے جو آدمی کے وجود میں شامل اور داخل ہو، نہ کہ وہ جس کا آدمی سے بہت دور کا رشتہ و تعلق ہو۔ شاہ صاحبؒ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے جی کی بات بدلیں یعنی اعتقاد اور نیت جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی نعمت چھینی نہیں جاتی۔''

مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ (جی کی بات) میں اعتقاد اور نیت نمایاں ہے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے اسی کا ذکر فرمایا ورنہ یہ الفاظ اس سے کہیں زیادہ پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

خدا کی اسی سنت کا ذکر سورہ الرعد کی آیت ۱۱ میں بھی کیا گیا ہے۔ وہاں آیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ''اللہ نہیں بدلتا جو ہے کسی قوم کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے لیے اپنے بیچ ہے۔'' شاہ صاحبؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

''یعنی اللہ اپنی نگہبانی سے اور مہربانی سے محروم نہیں کرتا کسی قوم کو جو ہمیشہ اس کی طرف سے رہی ہے جب تک وہ اپنی چال نہ بدلیں اللہ کے ساتھ۔''

(۲) وَ لَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ (ہود: ۱۱۰)

''اگر تمہارے رب سے ایک لفظ آگے نہ نکل گیا ہوتا تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔''

یہاں خدا کی ایک خاص سنت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی نامعقول رویہ اختیار کرتا ہے اور حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ناحق کی پیروی کرتا اور خدا کی کتاب پر ایمان ہی نہیں لاتا اور اگر اسے مانتا بھی ہے تو اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی اسے فکر ہی نہیں ہوتی بلکہ کتابِ الٰہی کو اپنے افتراق و اختلاف کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کی اس روش کے پیچھے کوئی نیک ارادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ظلم و زیادتی کرنا چاہتا ہے، تو جو قوم اور شخص اس طرح کی روش اختیار کرتا ہے تو خدا فوراً اس کی گرفت نہیں کرتا، بلکہ اسے گمراہیوں میں بھٹکنے دیتا ہے۔ خدا چاہے تو فوراً اس کا فیصلہ کر دے اور زمین ایسے ظالموں کے ناپاک وجود سے پاک ہو جائے، اور لوگوں کو دنیا ہی میں معلوم ہو جائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آگ میں ہاتھ پڑتے ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آگ کوئی ایسی تماشہ اور تفریح کی چیز نہیں ہے، جس کے ساتھ کوئی

https://telegram.me/ilmokiab

کھیلے۔لیکن کفر وشرک اور ظلم وافتراق کی روش پر آدمی چلتا ہے تو فوراً اس پر کوئی بجلی نہیں گر جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے فیصلہ کے لیے ایک دن یوم الحساب کا مقرر کر رکھا ہے۔اس دن کوئی بھی اس کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔اس دن وہ جہنم کو نافرمانوں اور اپنے باغیوں سے بھر دے گا اور ان کو کہیں بھی کوئی جائے پناہ نہ مل سکے گی۔دنیا میں حق اور ناحق اس طرح عیاں ہو جائے کہ کسی ظالم اور بدنیت شخص کو بھی انکار کی مجال نہ ہو سکے۔تو دنیا آزمائش کی جگہ ہونے کے بجائے دار الجزاء بن جائے یہاں تو حق تک رسائی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے اندر اس کی طلب ہو، جو کسی طرح کی کجی اور مفسدانہ ذہنیت نہ رکھتا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا نے جو کتاب اُتاری تھی بنی اسرائیل نے اس کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ان کی اس بے جا روش پر قرآن کہتا ہے کہ اگر ایک بات پہلے تیرے رب کی طرف سے نہ نکل چکی تھی تو ان کا فیصلہ ہو جاتا۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

’’کتاب دی تھی راہ بتانے کو اس کے سمجھنے میں اختلاف کرنے لگے اور لفظ آگے ہو چکا یہ کہ دنیا میں سچ اور جھوٹ صاف نہ ہو۔‘‘

یعنی خدا کا یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا کہ حق اور ناحق کا اصل فیصلہ قیامت کے دن ہو، ورنہ حق اور ناحق کا فیصلہ دنیا ہی میں بلا تاخیر کر دیا جاتا۔

(۳) يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝ (السجدۃ:۵)

’’تدبیر سے اُتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک، پھر چڑھتا ہے اس کی طرف ایک دن جس کا اندازہ ہزار برس ہیں تمہاری گنتی میں۔‘‘

اس آیت میں بھی خدا کی ایک سنت کا ذکر ہے۔اگر حالات موافق نہ ہوں تو انسان بہت پریشان ہو جاتا ہے وہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر حالات کیوں نہیں بدلتے۔اہل ایمان کو آخر کب تک پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

فلاں قوم آخر کیوں بامِ عروج پر ہے جب کہ اسے اپنی بے کرداری کی وجہ سے قعرِ مذلت

https://telegram.me/ilmokiab

میں ہونا چاہیے۔ یہاں انسان کو بتایا جارہا ہے کہ وہ حقائق کو اپنے چھوٹے ذہن کے پیمانے سے نہ دیکھے۔ سارے معاملات درحقیقت اس خدا کے ہاتھ میں ہیں جو علیم وخبیر ہے، جس کا منصوبہ محدود مدت کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ آئندہ پیش آنے والے بہت سے حقائق اس کے سامنے ہوتے ہیں جو انسان کی نگاہ میں نہیں ہوتے۔ عام آدمی بھی کم از کم ایک دن کی اسکیم بنا کر کام کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ایک گھنٹہ کا پروگرام وہ ایک ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بناتا ہو۔ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو کوئی کام بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا۔ اور ایسا آدمی کوئی بڑا اور عظیم کام تو انجام ہی نہیں دے سکتا۔ خدا کے یہاں ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے۔ یہ فرما کر درحقیقت اس بات کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ تم اگر دن بھر کا منظم پروگرام بناتے ہو تو تمہارا کیا خیال ہے کہ خدا کا سارا کام بلا کسی منصوبہ اور اسکیم کے چل رہا ہے۔ تم اگر کوئی کام ایک دن کو سامنے رکھ کر چھیڑتے ہو تو کیا یہ ضروری ہے کہ خدا کا پروگرام بھی تمہاری طرح بارہ یا چوبیس گھنٹہ ہی پیش نظر رکھ کر ترتیب پاتا ہو۔ اس کے منصوبوں کو سمجھنے کے لیے یوں سمجھ لو کہ اس کا دن تمہارے ہزار برس کے مساوی ہے۔ اس کے کتنے ہی فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو سیکڑوں سال کی مدت کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے ہوتے ہیں۔ انسان آخر اس کی مصلحتوں کو وقت سے پہلے کیوں کر جان سکتا ہے۔ اس کے لیے بس اتنا جان لینا کافی ہوتا ہے کہ زمانہ کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تاریخ میں اُلٹ پھیر آسمانی فیصلے کے تحت ہوتا ہے۔

اب شاہ صاحبؒ کے الفاظ پڑھیے:

> ”بڑے بڑے کام عرش سے مقرر ہو کر نیچے حکم اُترتا ہے۔ سب اسباب اس کے آسمان و زمین سے جمع ہو کر بن جاتا ہے۔ پھر ایک مدت جاری رہتا ہے۔ پھر اٹھ جاتا ہے اللہ کی طرف۔ دوسرا رنگ اترتا ہے جیسے بڑے بڑے پیغمبر جن کا اثر قرنوں رہا یا بڑی قوم میں سرداری جو عمروں چلی وہ ہزار برس اللہ کے ہاں ایک دن ہے۔“

شاہ صاحبؒ نے مختصر الفاظ میں قوموں اور پیغمبروں کی تاریخ کے بارے میں کتنا صحیح فرمایا ہے کہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ تاریخ اگر کروٹیں لیتی ہے تو یہ خدا کی اپنی اسکیم ہوتی ہے۔ قرنوں کی مدت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے یہاں ایک دن کی اسکیم کے مثل ہے۔ لیکن انسان

https://telegram.me/ilmokiab

کی نظر چوں کہ صدیوں کو حاوی نہیں ہوتی، اس لیے تاریخ کے بہت سے راز اور کارفرما اخلاقی قانون تک اس کی نگاہ نہیں جاتی اور اسے تاریخ کے پیچھے کوئی غیبی منصوبہ دکھائی نہیں دیتا۔

خدا کی اسی سنت اور اسکیم کا ذکر سورۃ الحج آیت ۴۷ میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوا ہے:

وَ یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَ اِنَّ یَوْماً عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (الحج:۴۷)

''اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز نہیں ٹالتا اپنا وعدہ اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کے برابر ہے۔''

(۱۶) کائنات کی گواہی

وَ ھُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ وَ اَنْھَارًا ؕ وَ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْھَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (الرعد:۳)

''اور وہی ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس میں بوجھ رکھے اور ندیاں بنائیں، اور ہر میوے کے اس میں جوڑے رکھے دوہرے۔ ڈھانکتا ہے دن پر رات اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔''

اس میں ایک اس بات کی بھی نشانی ہے کہ ان چیزوں کے بنانے میں کسی ہستی کے ارادے کا دخل ہے۔ یہ چیزیں محض اپنی ذاتی خاصیتوں کی وجہ سے وجود میں نہیں آ گئی ہیں۔ میوے اور پھل بنائے تو اس کے جوڑے رکھے۔ ان کی کوئی قسم کامل نظر آتی ہے تو کسی کو کم تر رکھا۔ دن کے ساتھ رات بنائی۔ ایک اگر روشن ہے تو ایک تاریک ہے۔ یہ رنگارنگی اور تنوع کیوں ہے؟ لازماً اس کے پیچھے کسی کا ارادہ اور اس کی پسند کام کر رہی ہے؟ اگر ہر چیز محض اپنی بے شعور خاصیت سے وجود میں آتی تو اس میں تنوع اور رنگارنگی کا پہلو نہ پایا جاتا۔ کوئی بے شعور خاصیت زیادہ سے زیادہ کوئی ایک اثر دکھا سکتی۔ مثال کے طور پر بے جان پتھر کے کسی ٹکڑے کی کوئی ایک شکل ہو سکتی ہے وہ گوناگوں شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک بچہ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ

https://telegram.me/ilmokiab

ایک حالت میں رہ سکتا ہے وہ کبھی ایک طرف جائے گا تو کبھی دوسری طرف لپکے گا۔ وہ پتھر کی طرح ایک جگہ بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ بچے کے بارے میں قطعی طور پر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ لازماً فلاں سمت جائے گا۔ اس لیے کہ جہاں ارادہ اور اختیار پایا جاتا ہے وہاں عمل کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ قطعی طور پر وہاں کسی ایک طرزِ عمل کی بات نہیں کہی جاسکتی۔

یہی حال اس دنیا کا ہے۔ یہاں کوئی ایک ہی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہاں دریا بھی ہیں اور پہاڑ بھی یہاں دن ہی نہیں رات بھی آتی ہے۔ محض میوہ ہی نہیں اس کی بے شمار قسمیں بھی ہیں۔ کیا ان سب کے پیچھے محض بے شعور مادہ کی خاصیت یا اثر کام کر رہا ہے؟ یہ تسلیم کیسے کیا جاسکتا ہے جب کہ خصوصیات یہاں شعور اور ارادہ کی ظاہر ہو رہی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ بے شعوری کے ساتھ ہوتا تو تنوع اور رنگا رنگی ظہور میں نہ آتی۔ دنیا میں ایک ہی چیز کی مختلف انواع اور مختلف رنگ کیا اس بات کی واضح علامت نہیں ہیں کہ ان کے پیچھے اصلاً مادہ کی بے شعور خاصیت نہیں بلکہ کسی ہستی کا شعور وارادہ کام کر رہا ہے۔ اگر کسی بے شعور خاصیت میں وہ باتیں بھی پائی جائیں جن کے لیے شعور وارادہ اور پسند یا انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر بے شعور خاصیت اور باشعور وجود میں مابہ الامتیاز کیا چیز رہتی ہے۔

شاہ صاحب کی نگاہ سے یہ لطیف ترین فطری دلیل اوجھل نہ ہوتی۔ یہ ان کے قرآنی اندازِ فکر اور کمالِ ذہن کی واضح مثال ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ”ہر میوے کے جوڑے یعنی ایک قسم کامل، ایک قسم ناقص اور رات دن ایک اندھیرا، ایک اُجالا رنگا رنگ چیزیں بنائیں۔ نشان ہے کہ اپنی خوشی سے بنایا۔ اگر ہر چیز خاصیت سے ہوتی تو ایک سی ہوتی۔“

(۱۷) تاریخ کیا کہتی ہے؟

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۝ (النحل:۳۶)

https://telegram.me/ilmokiab

”اور ہم نے ہر امت میں رسول اٹھائے ہیں کہ اللہ کی بندگی کرو، اور طاغوت سے بچو۔ تو کسی کو اللہ نے راہ دی اور کسی پر گمراہی ثابت ہو کر رہی۔ تو زمین پر چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔“

یہاں تاریخی شہادت اس لیے پیش کی جا رہی ہے کہ خدا کے نافرمان لوگوں اور ظالموں کا انجام کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا، کتنے ہی ویرانے اور کھنڈرات اب تک ان کی تباہی اور بربادی کی گواہی دے رہے ہیں۔ حالاں کہ کبھی دنیا میں عیش وراحت کے سارے ہی سامان انہیں حاصل تھے، لیکن آج تاریخ میں صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے ہیں۔ کیا ان کا یہ حسرت ناک انجام اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ انسانی تاریخ کے پیچھے کوئی اخلاقی قانون بھی کام کر رہا ہے۔ یہ دنیا یوں ہی شترِ بے مہار نہیں ہے۔ کوئی ہے جو تکوینی اور حس وحیات کی دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ظلم کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو عالم انسانی کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ وہ تدارک کرتا ہے اور پورے تدارک کے لیے اس نے لازماً کوئی دن مقرر کر رکھا ہوگا۔ یہ وہی دن ہے جسے نبیوں نے قیامت کا دن کہا ہے۔ قیامت کے دن کو اگر ہم اس دنیا سے الگ کر کے سوچتے ہیں تو وہ ایک دور کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر چیز کا تدارک اسی دنیا میں ہو جائے۔ یہ ہماری کوتاہ نظری ہے۔ پورے طور سے تدارک قیامت کے بغیر ممکن نہیں۔ قیامت اپنی حقیقت کے لحاظ سے تدارک ہی ہے۔ تدارک اور تلافی کے لیے جتنی چیزیں ناگزیر ہیں، وہ سب فراہم ہوں گی۔ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ قیامت میں پیش نہ آئے گی۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

”پہلی اُمتوں کا احوال سنا کر فرمایا کہ یہ جہاں خالی نہیں پڑا۔ سر پر ایک مدبر ہے ہر چیز کا تدارک کرنے والا۔ پورا تدارک آخر کو قیامت ہے۔“

وہ تدارک فرمائے گا۔ پورا تدارک ہی قیامت ہے۔ اگر پورے تدارک کا تصور کیا جائے تو اس کی جو شکل ذہن میں اُبھرتی ہے وہ قیامت کی تصویر کے سوا کوئی اور تصویر نہیں ہو سکتی۔

(۱۸) انفس کی شہادت

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ

https://telegram.me/ilmokiab

مُوْسٰیٓ اِمَامًا وَّ رَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ھود:۱۷)

"بھلا ایک شخص اپنے رب کی نظر آتی راہ پر ہے اور اس سے اس کی گواہی پہنچتی ہے اور اس سے قبل موسیؑ کی کتاب پیشوا اور رحمت ہے۔ ایسے ہی لوگ اسے مانتے ہیں اور جو اس کا انکار کرے سب فرقوں میں سے تو اس کا وعدہ آگ ہے پس اس کی نسبت شبہ میں مت رہو بے شک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ یقین نہیں لاتے۔"

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ سیدھے اور صحیح راستے پر کون شخص ہوتا ہے اور حق کا دشمن اور باغی کسے کہا جائے جو جہنم کی سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

حق اصل میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ حق کی اصل پہچان جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ آدمی کو اس کے حق ہونے کی گواہی پہنچ رہی ہو۔ اور اگر اگلی آسمانی کتاب کے ساتھ اس کا ربط وسلسلہ بھی قائم ہو تو یہ چیز مزید تقویت کا باعث ہوتی ہے۔

قرآن جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ بینہ یعنی کھلی ہوئی اور واضح حقیقت ہے جو اپنے صحیح اور درست ہونے کی بذاتِ خود دلیل ہے۔ قرآن کو مطلوب ہی یہ ہے کہ آدمی صرف یہی نہیں کہ حق پر ایمان لائے بلکہ وہ علی وجہ البصیرت ایمان لائے۔ پھر قرآن ایسی کتاب ہے جو اگلی آسمانی کتابوں کے مطابق ہے۔ اگلی کتابوں سے اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو اس سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات تھیں۔ قرآن کی آواز کوئی اجنبی آواز نہیں ہے۔ اس کا پیغام وہی ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بار بار اترتا رہا ہے۔ اب جو شخص قرآن کو آسمانی کتاب مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اس کے برسرِ حق ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بہ خلاف جو شخص قرآن کو ماننے سے انکار کرے اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک ایسی سچائی کو ماننے سے انکار کر رہا ہے جس کے حق ہونے میں کسی شک وشبہ کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ ایسے ظالم شخص کو اس کی سرکشی کی سزا ملنی ہی چاہیے۔

https://telegram.me/ilmokiab

شاہ صاحبؒ نے یَتْلُوْہُ شَاہِدٌ مِّنْہُ (اور اس سے اس کو گواہی پہنچتی ہے) کے سلسلے میں ایک اہم پہلو کی وضاحت فرمائی ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آدمی کو حق کی گواہی یا شہادت پہنچتے رہنا ایسی چیز ہے جس سے صرف یقین ہی حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس سے علم ویقین ہمیشہ تازہ ہوتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ حق کی بڑی اہم گواہی ہے۔ یہ شہادت آدمی کو اپنے اندر سے ملتی ہے۔ دین حق کی روشنی اور لذت اور قرآن کی حلاوت جب آدمی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے تو اس صورت میں حق سے کوئی بعد اور دوری باقی نہیں رہتی۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''گواہی پہنچتی ہے یعنی دل میں اس دین کا نور اور مزہ پاتا ہے اور قرآن کی حلاوت۔''

(١٩) نظریۂ آخرت

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (النور:٣٩)

''اور جو لوگ منکر ہیں ان کے اعمال جیسے میدان میں سراب ہو کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ نہ پائے۔ اور اللہ کو اس کے پاس پائے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔''

اس آیت میں منکروں کے اعمال کی حیثیت مثال کے ذریعے واضح کی گئی ہے، جس طرح کوئی پیاسا شخص کسی میدان میں سراب دیکھ کر اسے پانی سمجھ لیتا ہے، لیکن جب وہ اس کے پاس اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے پہنچتا ہے، تو اُسے وہاں پانی کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔ ٹھیک یہی حالت دنیا میں منکروں کی ہے کہ وہ اپنی سمجھ سے نیکیاں کرتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی نیکیاں ان کے کام آئیں گی لیکن جب نتیجہ سامنے آئے گا تو اُنہیں معلوم ہوگا کہ وہ سخت دھوکے میں رہے، ان کے سارے اعمال سراب ثابت ہوں گے۔ دنیا میں انھوں نے صحیح فکر اور شعور سے کام نہیں لیا اور خدا کے ساتھ اپنے معاملے کو درست کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے لیے اُن کے سارے اعمال رائیگاں جائیں گے۔ وہ باشعور ہستی جس نے اُنہیں فکر وشعور کی نعمت

https://telegram.me/ilmokiab

سے نوازا تھا ان سے باز پرس کرے گی اور اُنہیں اپنے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔ حساب لینے میں خدا سے ہرگز تساہل نہ ہوگا۔ منکر اپنے کیے کی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔

اس تمثیل میں قرآن نے اصل حقیقت کو ملا کر پیش کیا ہے کہ گویا وہ زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ہماری زندگی کا ایک لاینفک حصہ ہے۔

شاہ صاحبؒ نے یہاں ایک نہایت لطیف پہلو کا ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تمثیل ایسے منکروں کی ہے جو غیب کی طرف دیکھتے اور اس سے اپنی زندگی کا رشتہ بھی قائم کرتے ہیں، مگر اس کا وہ پاس ولحاظ نہیں کر پاتے بلکہ بھٹک کر ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جس میں عالم غیب کی کوئی رعایت ملحوظ نہیں ہوتی۔ خدا کا دین ہی ہے جس پر قائم رہنے میں غیبی امور کی پوری رعایت اور لحاظ پایا جاتا ہے۔ خدا کے دین کی مخالفت آدمی کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ خواہ اپنے زعم میں وہ خود کو صحیح راستے پر سمجھتا ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ اس کے اعمال اکارت نہیں جائیں گے بلکہ خدا کے یہاں ان کا اسے پورا پورا بدلہ ملے گا۔ لیکن نتیجہ بالکل اس کے برعکس سامنے آئے گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ”کافر دو طرح کے ہیں: ایک غیب کی طرف تاکتے پھر بہک کر اللہ کا دین چھوڑتے ہیں۔ غلط راہیں پکڑتے ہیں۔ یہ ان کی کہاوت ہے۔ ریت کو پانی سمجھ کر دوڑے پانی نہ ملا۔ آخرت میں اپنے گناہوں کی سزا ملی۔ دوسرے وہ ہیں جو دنیا میں غرق ہیں یا پتھر پوجتے ہیں۔ ان کی کہاوت آگے فرمائی۔ ان کے پاس ریت بھی نہیں، اندھیرے میں بند ہو رہے ہیں۔“

منکر غیب کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن وہ غیب وحی کی راہ نمائی کے بغیر ان کے لیے سراب ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس پر ٹھیر نہیں پاتے۔ سراب کو دیر تک پانی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح وہ غیب پر دیر تک قائم نہیں رہ پاتے۔ خدا کا دین ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور بھٹک کر رہ جاتے اور غلط راہوں میں نکل جاتے ہیں۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ اور اعمال اکارت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے اعمال وافکار سے نہ تو دنیا میں اُنہیں بلندی حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ آخرت میں ان کے کام آئیں گے۔ دوسری قسم کے کافروں کی جس مثال کا ذکر شاہ صاحب نے کیا ہے وہ یہ ہے:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ

https://telegram.me/ilmokiab

سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ ۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا
وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ○ (النور:۴۰)

''یا جیسے گہرے دریا میں تاریکیاں ہوں اس کے اوپر موج چڑھتی آتی ہو۔ موج کے اوپر اور موج، اس کے اوپر بادل، تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوں۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو سجھائی دیتا معلوم نہ ہو، جسے اللہ نے روشنی نہ دی اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔''

جسے کسی غیب کی طرف راہ نمائی حاصل نہ ہوسکی اس کے حصے میں کوئی روشنی نہیں وہ تو گہری تاریکیوں میں ہی بند رہے گا۔

(۲) اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (النحل:۳۲)

''جن لوگوں کی روح فرشتے پاکیزگی کی حالت میں قبض کرتے ہیں، کہتے ہیں سلام ہے تم پر، جنت میں جاؤ اس کے بدلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔''

اس سے پہلے ظالم منکروں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں پڑے رہو، پھر بتایا گیا ہے کہ مغرور لوگوں کا برا ٹھکانہ ہے۔ اس کے برعکس جو خدا کا خوف رکھتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی ہے اور اہل تقویٰ کا کیا خوب گھر ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی اور اس کے اصل ٹھکانے کے درمیان میں جو اصلاً چیز حائل ہے وہ دنیا کی زندگی ہے نہ کہ عالم برزخ۔ مرنے کے بعد آدمی جنت یا دوزخ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ برزخ کا مرحلہ نا قابل لحاظ ہوتا ہے۔ ایک تو برزخ کی مدت مرنے والے کے لیے انتہائی مختصر ہوتی ہے۔ اتنی مختصر جیسے کسی کو تھوڑی دیر کے لیے نیند آ جائے پھر معمول کے مطابق وہ بے دار ہو جائے۔ دوسرے یہ مختصر مدت بھی اہل ایمان کے لیے بے کیف نہیں ہوتی۔ ان کی روح اپنی پاکیزگی کی وجہ سے جنت کی فضا سے دور نہیں ہوتی۔ اس طریقے سے جنت میں ایک طرح کا داخلہ اُنہیں مرنے کے بعد ہی مل جاتا ہے۔ قیامت میں جب اُنہیں جسم عطا ہوگا تو جسمانی طور سے بھی وہ جنت میں قیام کریں گے۔ اس لیے اگر فرشتے اہل ایمان کی

https://telegram.me/ilmokiab

روح قبض کرتے وقت ان سے یہ کہتے ہیں کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جنت میں جاؤ اس کے بدلے میں جو تم کرتے رہے ہو) تو یہ کوئی بے محل بات نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ اس راز سے بہ خوبی واقف ہیں، چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

''روح قبض ہونے کے بعد جنت میں روحانی جانا ہے اور جسمانی جانا مخصوص ہے قیامت کے دن کے لیے۔''

(۳) اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ٥ (الروم:۸)

''کیا وہ دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں۔ اللہ نے جو بنایا آسمان اور زمین اور جو ان کے بیچ ہے سو ٹھیک سادھ کر اور ٹھیرے وعدہ پر اور بہت سے لوگ اپنے رب کا ملنا نہیں مانتے۔''

شاہ صاحبؒ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی ہر چیز کو ایک ابتدا، ایک انتہا ہے۔ انسان، حیوان، درخت کو تو نظر آتا ہے۔ آسمان میں ہر گردش کی ایک مدت ہے۔ مہینے یا برس یا بارہ برس پر ختم ہے، جو ہر چیز میں صفت ہے سو سارے جہان میں ہے۔ اپنے وقت پر اس کو فنا ہے۔ پھر یہ ابتدا انتہا کھیل نہیں، کچھ اس سے منظور ہے وہی آخرت میں نظر آوے گا۔''

شاہ صاحبؒ نے آیت کی روشنی میں جو لکھا ہے وہ ان کے فکر و تدبر کی واضح مثال ہے۔ یہاں جو چیز بھی پیدا کی گئی ہے وہ ایک منصوبے کے طور پر ایک خاص مدت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ابتدا کی طرح اس کی ایک انتہا بھی ہے۔ انسان حیوانوں اور جانوروں کے سلسلے میں تو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ یہاں ہر چیز کی ایک انتہا ہے کوئی انسان یہاں ہمیشہ کے لیے نہیں پیدا کیا جاتا۔ یہی حال جانوروں اور درختوں کا بھی ہے۔ ہم کتنے ہی درختوں کو اُگتے بڑھتے اور گرتے دیکھتے ہیں۔ آسمان کے سورج چاند اور تاروں وغیرہ کی گردش کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ کسی کی گردش مہینے میں پوری ہوتی ہے۔ کسی کی سال بھر میں اور کسی کی گردش پوری ہونے میں بارہ سال لگ جاتے ہیں۔ یا اس سے بھی زیادہ مدت لگتی ہو۔ جب کوئی چیز اس قانون سے علیحدہ نہیں ہے

https://telegram.me/ilmokiab

اور یہ ایک عالم گیر اور آفاقی قانون ہے تو لازماً بحیثیت کل سارے جہان کا بھی یہی قانون ہونا چاہیے۔ اس لیے ایک دن یہ سارا جہان بھی فنا ہو کر رہے گا۔ لیکن فطری طور پر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ابتدا اور انتہا کس لیے۔ ہے؟ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہو سکتا۔ لازماً اس کا کوئی مقصد ہوگا۔ شاہ صاحب کا یہ فقرہ کس قدر سائنٹفک اور قرآن کے استدلال کے عین مطابق ہے:

''یہ ابتدا انتہا کچھ کھیل نہیں، کچھ اس سے منظور ہے وہی آخرت میں نظر آوے گا۔''

آخرت کو مانے بغیر موجودہ کائنات بے معنیٰ اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، اس لیے لازماً آخرت آئے گی۔ اس کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے۔

(۴) يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ (الحدید: ۱۳)

''جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے کہ ہم پر نظر کرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔ کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹ جاؤ۔ پھر روشنی ڈھونڈو۔''

یعنی روشنی تو خود حاصل کرنی تھی۔ یہ روشنی تو آدمی کی اپنی شخصیت میں شامل ہوتی ہے۔ آج کوئی اور روشنی یا کسی دوسرے کی روشنی کام نہیں آ سکتی۔ یہ روشنی ایمان و اعمال کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے کسی مرحلے میں اُدھار لے کر کام نہیں چلایا جا سکتا، لیکن تم اس کی طرف سے بالکل غافل رہے۔ حق کو مان کر اپنی سیرت اور کردار کی تعمیر کرنے کی بجائے تم نے نفاق کا طریقہ اپنایا۔ تم نے خود اپنی روشنی بجھائی ہے۔ تاریکی کے سوا اب اور کیا تمہارے حصے میں آ سکتا ہے، دنیا کی زندگی میں تمہیں اس کا موقع دیا گیا تھا کہ تم کسب نور کر سکو، لیکن تم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اب وقت نکل گیا۔ اگر پیچھے لوٹ کر روشنی لا سکتے ہو تو جا کر لے آؤ لیکن اب یہ کہاں ممکن ہو سکتا ہے۔ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (پیچھے لوٹ جاؤ پھر روشنی ڈھونڈو) کے ذیل میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''یعنی روشنی دنیا میں کمائی جاتی ہے وہ جگہ پیچھے چھوڑ آئے۔''

(۲۰) آواگون کی تردید

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ

https://telegram.me/ilmokiab

صَالِحاً فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّآ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ
اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ٥ (المؤمنون:۱۰۰)

’’یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو کہے گا اے میرے رب! مجھے پھر بھیجو شاید میں اس میں جسے پیچھے چھوڑ آیا کچھ نیکی کروں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے، اور ان کے پیچھے ایک آڑ ہے اس دن تک جب کہ اٹھائے جائیں گے۔‘‘

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد منکروں کو اس کا پورا احساس ہوگا کہ انھوں نے دنیا میں آخرت کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے، وہ چاہیں کہ اُنہیں اگر دنیا میں مزید ایک بار لوٹنے کا موقع ملتا تو وہ آخرت کے لیے کچھ سامان کر سکتے۔ لیکن مرنے کے بعد دوبارہ لوٹ کر آنا یا دوبارہ کسی کا یہاں پیدا ہونا ممکن نہ ہوگا۔ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی وہ کفِ افسوس ملتے ہی رہیں گے۔ ایک آڑ یا رکاوٹ درمیان میں حائل ہوگی یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا، جب سارے ہی لوگ دوبارہ جسمانی طور پر زندہ کیے جائیں گے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ تناسخ یا آواگون کا نظریہ باطل ہے۔ موت کے بعد دنیا میں دوبارہ آ کے کسی کو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ ہمیں آج اگر کچھ کرنے کا موقع حاصل ہے تو یہ پہلا اور آخری موقع ہے اگر ہم غافل رہ گئے تو پھر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

شاہ صاحبؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

’’معلوم ہوا یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ آدمی مر کر پھر آتا ہے سب غلط ہے۔ قیامت کو اٹھیں گے اس سے پہلے ہرگز نہیں۔‘‘

(۲۱) حقائق

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ
الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ٥ (السجدة:۹)

’’پھر اسے درست کیا اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم شکر تھوڑا ہی کرتے ہو۔‘‘

https://telegram.me/ilmokiab

انسان کی جان ہی کا نہیں اس کے جسم کا بھی مالک خدا ہی ہے، لیکن اس نے صرف جان یا روح کو اپنی طرف منسوب کیا، جسم و جسد کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ روح کو خدا سے خاص مناسبت حاصل ہے، جس طرح خدا ایک غیبی ہستی ہے اسی طرح بھی مادّی نہیں ہے۔ وہ غیب سے آتی ہے۔ بدن کی طرح وہ مٹی اور پانی سے مل کر نہیں بنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کنہ کو جاننا ہمارے لیے مشکل ہے، جس طرح خدا زندہ جاوید ہے اسی طرح روح بھی سراپا حیات ہے، جسم کی زندگی بھی درحقیقت روح سے ہی وابستہ ہے۔ اس لیے بدن کے مقابلہ میں روح کو امتیاز اور شرف حاصل ہے۔ جسم کا یہ حال ہے کہ وہ بسیط نہیں مرکب (Composite) ہے، مختلف اعضا اور جوارح کی ترکیب سے وہ وجود میں آیا ہے۔ خدا کی ہستی اس نقص سے یکسر پاک ہے، اس لیے اس نے اپنے لیے روح کا لفظ استعمال کیا، لیکن جسم و جسد کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔

شاہ صاحبؒ ان سب پہلوؤں کا ذکر مختصر الفاظ میں اس طرح کیا ہے۔

"اپنی جان میں سے جو مخلوق ہے اسی کا مال ہے، مگر جس کو عزت دی اس کو اپنا کہا جیسے فرمایا: اِنَّ عِبَادِیْ (میرے بندے) سو انسان کی جان غیب سے آئی ہے۔ مٹی پانی سے نہیں بنی، اس کو اپنی کہا اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ کی جان ہو تو بدن بھی ہو، بدن ہو تو ترکیب بھی ہو، تو ذات پاک کہاں رہی۔"

(۱) وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ۝ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُلُوْدِ۝ (ق:۳۱-۳۴)

"اور بہشت ڈر رکھنے والوں کے قریب لائی گئی، دور نہ رہی، یہ ہے جس کا وعدہ ہے تم سے ہر ایک رجوع رہنے اور یاد رکھنے والے کے لیے، جو رحمٰن سے بن دیکھے ڈرا اور دل لے کر آیا جس میں رجوع ہے۔ داخل ہو جاؤ اس میں سلامتی کے ساتھ۔ یہ ہے دن ہمیشہ رہنے کا۔"

انسان جس چیز کا متلاشی ہے اس کی فطرت کو جس چیز کی تلاش ہے بتایا جا رہا ہے کہ وہ شے اُسے حاصل ہوگی۔ انسان ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جو ہمیشہ باقی رہے، وہ ایسی مسرت کا

https://telegram.me/ilmokiab

آرزومند ہے جو عارضی اور زوال پذیر نہ ہو، وہ ایسی بہار کا خواب دیکھتا ہے جو خزاں نا آشنا ہو وہ چاہتا ہے جو چیزیں اُسے مل نہیں سکی ہیں وہ اسے ملیں اور جو ملیں وہ ہمیشہ باقی رہیں۔ دنیا میں اس کی تمام آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔ سوال یہ ہے کہ جو تمنائیں اور خواہشات پوری نہیں، ہوتی ہیں وہ پیدا کہاں سے ہوتی ہیں۔ حیوانات کا اگر کوئی مستقبل نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں کیوں کہ ان کے یہاں مستقبل کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، لیکن انسان کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

قرآن کی ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان جس چیز کی تمنا کرتا ہے وہ اسے یقیناً حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس کا قدر شناس ہو اور جس کو یہ خبر ہو کہ جو نعمتیں اسے حاصل ہیں وہ اپنے آپ حاصل نہیں ہوتی ہیں وہ خدا کی عطا کردہ ہیں اور اسی مہربان خدا سے اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اسے ایسی چیزیں بھی عطا فرمائے جو ابھی اسے مل نہیں سکی ہیں۔ اور اگر وہ ناراض ہو جائے تو انسان کے حصے میں حسرت وخسران کے سوا اور کچھ نہیں آ سکتا۔ اس احساس و علم کے ساتھ جو لوگ زندگی بسر کریں گے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ ان کے دل یقیناً خشیت اور انابت کی کیفیت سے معمور ہوں گے۔ اس کے بعد یہ ممکن نہیں کہ خدا اُنہیں محروم رکھے۔

بہر حال ایک دن ایسا آئے گا جب خدا کے اطاعت گزار بندے اپنے رب سے وہ سب کچھ پالیں گے جس کے وہ ضرورت مند ہیں، اور جن کی وہ آرزو کرتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اُنہیں وہ کچھ بھی حاصل ہوگا جس کا وہ آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خدا انہیں جو کچھ عطا کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے ہوگا عارضی نہ ہوگا۔ شاہ صاحبؒ ذٰلِکَ یَوْمُ الْخُلُوْدِ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"اس دن جس کو جو ملا سو ہمیشہ ہے۔ اس سے پہلے ایک بات پر ٹھہراؤ نہ تھا۔"

(۲۲) نفسیاتی حقائق

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلاًo وَ اِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَیْھَا صَعِیْداً جُرُزاًo (الکہف: ۷، ۸)

"زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے اس کی رونق بنایا تا کہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون

https://telegram.me/ilmokiab

اچھا عمل کرتا ہے اور جو کچھ اس پر ہے ہمیں اس کو چھانٹ کر میدان کرنا ہے۔"

شاہ صاحبؒ نے اس آیت کے سلسلے میں نظم کلام کی روشنی میں ایک نفسیاتی حقیقت کو پیش فرمایا ہے۔ خدا نے زمین کو آراستہ کیا ہے اور اسے خوب رونق بخشی ہے تاکہ وہ انسان کو آزمائے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"یعنی اس کی رونق پر دوڑتا ہے یا اس کو چھوڑ کر آخرت کو پکڑتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ انسان کی آزمائش اس بات میں ہے کہ وہ دنیا کی رونق پر ریجھ جاتا ہے یا وہ اس پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے۔ دنیا کی رونق تو ختم ہو جانے والی ہے، لیکن آخرت باقی رہے گی۔ کسی رونق کو دیکھ کر اس کی طرف لپکنا ایک عام بات ہے، لیکن جن لوگوں کو بصیرت حاصل ہوتی ہے ان کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان کی دوررس نگاہ محض ظاہر میں پھنس کر نہیں رہ جاتی وہ اس ظاہری رونق کے پیچھے کارفرما حقیقتوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اصل حقیقت کو جان لینے کے بعد وہ اسی کے حصول میں لگ جاتے ہیں۔ پھر دنیا کی کوئی زیب وزینت اُنہیں حقیقت سے غافل نہیں کرسکتی۔

خدا نے زمین کو ویران اور بے رونق نہیں بنایا بلکہ اسے اس نے زیب وزینت اور رونق بخشی ہے۔ اس میں اس بات کی آزمائش ہے کہ کون زینت سے حقیقی زینت کا سراغ پالیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے جو صحیح اور درست ہے۔

(۲) قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل:۱۰۷-۱۰۹)

"کہو، تم اسے مانو یا نہ مانو جنہیں اس کے آگے سے علم ملا ہے جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے، تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عظیم ہے ہمارا رب بے شک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا ہے اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور اس سے ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔"

نماز کے جتنے ارکان ہیں وہ فطری ہیں۔ قرآن میں فطری حقائق کی عکاسی پائی جاتی

https://telegram.me/ilmokiab

ہے۔نماز میں سجدہ دو دو بار رکھا گیا ہے۔ یہاں بھی دو سجدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل علم کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں۔ ان کے سامنے جب کتابِ الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو اس کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔یہ کلام اُنھیں اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیتا ہے۔انہیں اس میں عجیب جاذبیت اور کشش معلوم ہوتی ہے۔وہ اس ہستی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، جس کا کلام وہ سن رہے ہوتے ہیں۔یہ سجدہ فی الواقع اس کا اعتراف و اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کلام سنا وہ کوئی معمولی کلام نہیں ہے۔اس کے بعد دوسرا سجدہ اظہارِ عجز کے لیے ہوتا ہے۔یہ گویا اپنی حقیقت کا اظہار ہے۔ اپنی حقیقت کے اظہار کے لیے سجدہ سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔شاہ صاحب ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''نماز میں سجدہ دو بار ہوتا ہے، اس واسطے دو بار فرمایا۔پہلی بار اس کلام کی تاثیر سے تعجب آتا ہے اور دوسری بار عاجزی۔''

(۳) وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ...... وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (بنی اسرائیل:۲۶-۲۸)

''اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور محتاج کو اور مسافر کو اور فضول نہ اڑاؤ......اور اگر اپنے رب کی رحمت کے انتظار میں ان کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کہو۔''

مطلب یہ ہے کہ خدا نے اگر تمہیں دیا ہے تو لوگوں کے حقوق پہچانو اور اپنے مال سے ان کی مدد کرو۔تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا محتاجوں اور ضرورت مندوں کو تمہارے ہاتھ سے دلانا چاہتا ہے۔اس شرف سے خود کو محروم نہ کرو۔یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جن ضرورت مندوں کو تم سے مالی مدد اور تعاون ملتا رہتا ہے اور وہ تم سے امید رکھتے ہیں۔خدا کو پسند نہیں کہ انہیں کبھی تمہاری طرف سے تکلیف پہنچے اور وہ تمہیں اپنا غم خوار نہ پائیں۔اگر دینے کو کبھی تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو اس موقع پر بھی ضرورت مندوں کی آس نہ توڑو، ان سے نرم بات کرو اور امید دلاؤ کہ انشاء اللہ انتظام ہوتے ہی تمہارا خیال رکھا جائے گا۔تمہاری معذرت سوز اور جذبۂ ہمدردی سے خالی نہ

https://telegram.me/ilmokiab

ہو۔ تمہاری کریمانہ خو اور تمہارے حسنِ اخلاق میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ اگر تم ضرورت مندوں کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور تمہارا پہلا انداز نہ رہا تو تمہاری اگلی خیرات اور انفاق اکارت گیا۔ اس لیے کہ ظاہر میں جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ تمہاری اندرونی حالت کا اظہار محض ہے۔ اگر تمہاری فیاضی کا جذبہ اور اخلاص ہی مجروح ہو گیا تو تمہارا کیا، دھرا بے معنی ہو گیا۔ اس لیے کہ فیاضی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ جذبۂ انفاق اور اخلاص بھی ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ یہ جذبہ و اخلاص مسلسل باقی رہے۔ اس کے بغیر یہ ہماری شخصیت کا حصہ نہیں ہو سکتے اور جو چیز ہماری شخصیت اور ہماری ذات میں شامل نہ رہ سکے۔ اس کے ضائع اور برباد ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اب شاہ صاحبؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں اور دیکھیں کہ کس طرح ان کی نگاہ نازک سے نازک نفسیاتی حقائق کو پالیتی ہے۔ ہماری وضاحت تو اس لیے ہے کہ شاہ صاحبؒ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

> ''جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت اس کے پاس نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں امید والے کو محروم جانا خوش نہیں آتا، اس محتاج کی قسمت سے اللہ سخیوں کو بھیج دیتا ہے۔ سو اس واسطے اگر ایک وقت تو نہ دے، میٹھے جواب کہے کہ اگلی سب خیراتیں برباد نہ ہوں۔''

(۴) وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ○

(یٰسٓ: ۴۷)

> ''جب ان سے کہیے کہ کچھ اللہ کا دیا خرچ کرو تو منکر ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ اُسے کیوں کھلائیں جس کو اللہ چاہتا تو خود کھلاتا تو تم صریح غلطی میں ہو۔''

منکر کسی نیک کام میں خرچ کرنا چاہتے ہی نہیں ان میں فیاضی اور سخاوت کا جذبہ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، لیکن وہ اپنی کمزوری کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اپنی کمزوری کو تسلیم کریں تو ان کے لیے ہدایت کی بھی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنے کو اس مصیبت میں کیوں ڈالیں۔ وہ فوراً اپنے صحیح ہونے کے لیے تقدیر کا سہارا لے لیتے ہیں کہ جن غریبوں اور مسکینوں کو

https://telegram.me/ilmokiab

کھلانے کے لیے تم کہتے ہو انہیں تو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا پھر ہمیں ان کی فکر کیوں ہو۔ یہ منکروں کی محض چالبازی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں مال خرچ کرنے میں اپنا نقصان نظر آتا ہے۔ اصل بات نہ کہہ کر تقدیر کی بات کرنے لگتے ہیں۔ لیکن بات اگر ان کے اپنے فائدے کی ہو تو یہی لوگ تقدیر پر تکیہ نہیں کر سکتے بلکہ آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے، اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان کے آرام تک کو بھول جائیں گے، کاروبار یا تجارت میں جس میں انہیں اپنے فائدے اور نفع کی امید ہوتی ہے وہ کب سستی اور کاہلی دکھاتے ہیں۔ یہاں اُنہیں تقدیر کی بات یاد نہیں آتی۔ یہاں عمل کی اہمیت پوری طرح اُن کی سمجھ میں آتی ہے، لیکن جہاں معاملہ اعمال نیک اور انفاق کا ہوتا ہے۔ وہاں اُن کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ تضاد کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ ایسے لوگ سرے سے ہدایت سے محروم ہوتے ہیں، اپنی گمراہی کو چھپانے کے لیے ہزار بہانے تلاش کر لیتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''یہ گمراہی ہے کہ نیک کام میں تقدیر کا حوالہ اور اپنے مزے میں لالچ پر دوڑنا۔''

(۵) اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ ○ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ○ (یٰسٓ:۶۹، ۷۰)

''یہ تو محض یاددہانی اور واضح قرآن ہے تاکہ وہ اسے جس میں جان ہو ڈرائے اور کافروں پر بات پوری ہو۔''

معلوم ہوا کہ قرآن سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جس میں زندگی ہو، قرآن تو انسان کی حس اور اندرونی احساس کو چھیڑتا ہے۔ وہ اس کو روح اور فطرت کا تقاضا بن کر اس تک پہنچتا ہے، لیکن جو شخص بے جان ہو، جس کی روح اور فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو اور جس میں احساس کی کرن ہی زندہ نہ ہو وہ قرآن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی مثال تو بے جان پتھر کی ہے، جس پر اگر بارش ہو بھی تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس پر کوئی سبزہ اُگے گا یا وہ کوئی چمن زار بن سکے گا۔

کسی میں زندگی پائی جاتی ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ خوبی اور بھلائی کے اثرات قبول کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ اسے بھلے برے کی سرے سے کوئی پرواہ ہی نہ ہو یا کوئی خیر اور بھلائی اس کے سامنے پیش کی جائے تو وہ اس کا دشمن بن کر کھڑا ہو جائے، جن لوگوں کے اندر حس و حیات

https://telegram.me/ilmokiab

موجود ہوتی ہے وہ قرآن کریم کی آواز سے بیدار ہوجاتے ہیں اور زندگی کی صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں۔ لیکن جو محض مردہ ہیں جن کا شیوہ ہی انکار اور حق دشمنی ہے ان پر قرآن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان پر قرآن کے ذریعے سے صرف یہ دلیل قائم ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی کے ذمہ دار خود ہیں، کوئی دوسرا اس کا ذمہ دار نہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''جس میں جان ہو یعنی نیک اثر پکڑتا ہو اس کے فائدے کو اور منکروں پر الزام اُتارنے کو قرآن اُترا ہے۔''

(۲۴) نگاہِ حقیقت شناس

(۱) یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ۝

(العنکبوت:۵۴)

''تم سے عذاب کی جلدی مچاتے ہیں اور جہنم گھیر رہی ہے منکروں کو۔''

جب منکروں سے کہا جاتا ہے کہ انکار کی روش چھوڑ دو۔ حق کا انکار کر کے تم خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کا عذاب کہاں ہے؟ وہ آخر ہم پر کیوں نہیں آجاتا؟ کاش وہ عذاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے۔ قرآن جس عذاب اور جہنم سے باخبر کرتا ہے اس کی اصل تو منکروں کے اعمالِ بد اور ان کا انکار ہی ہے۔ وہ جو چیز طلب کرتے ہیں وہ اُن سے دور نہیں ہیں۔ کسی بھی درخت کے بیج میں اس کا درخت دیکھا جاسکتا۔ بیج میں درخت موجود ہی ہوتا ہے، صرف اس کا ظاہر ہونا باقی رہتا ہے۔ بیج کو دیکھ کر درخت کا انکار محض بے حسی اور بے پروائی ہے۔ منکروں کو اگر آنکھ ہو تو وہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کفر اور انکار آدمی کے لیے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آدمی کے وجود کو جو چیز قائم کیے ہوئے ہے وہ مادہ اور مادّی طاقتیں نہیں ہیں بلکہ اس کے پیچھے خدا کی رحمت اور اسی کی طاقت کام کرتی ہے۔ ورنہ بے حس مادّے میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ ہماری ضروریات اور لطیف ترین خواہشات کی تکمیل تک میں ہمارا ساتھ دے سکے۔ خدا کے سوا کسی اور کے بس میں نہیں کہ وہ یہ کام کر سکے۔ خدا کوئی بے جان مشین نہیں ہے۔

https://telegram.me/ilmokiab

خدا کا انکار اور اس کی مرضی کی خلاف ورزی آدمی کو اس کی رحمت سے الگ کر دیتی ہے۔ ہم اس سے اس کی اطاعت اور بندگی ہی کے ذریعے سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ یہ زمین و آسمان کی دنیا اس کی اطاعت پر قائم ہے۔ اس کی نافرمانی اور اس سے سرتابی تباہی اور جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کفر و انکار جہنم ہی کا سامان ہے۔ کفر و انکار میں پڑا ہوا آدمی در حقیقت جہنم ہی میں گھرا ہوتا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے تو اس لیے کہ اس پر ایک بے ہوشی طاری ہے۔ لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ ہم آگ کو پانی کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ مرنے کے بعد منکر کو جب ہوش آئے گا تو اسے پتہ چل جائے گا کہ وہ جس عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھا اس عذاب میں تو گھر ہی چکا تھا۔ یہی اعمالِ بد اور انکار اس کے لیے جہنم کی آگ ثابت ہوں گے اور اسے اس آگ سے بچنے کی کوئی راہ نظر نہ آئے گی۔ کوئی دوسرے سے تو بھاگ بھی سکتا ہے، خود اپنی ذات سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ وہ خود سے اپنے کو کیسے الگ کر سکتا ہے۔ اس نے تو خود کو جہنم بنا لیا۔ اب اس جہنم سے بچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔

آدمی کے پاس اگر حقیقت شناس نگاہ ہو تو آج کے اندر اسے کل کے امکانات صاف دکھائی دے سکتے ہیں۔ پھر کل اس کے لیے کل نہیں رہتا۔ وہ تو آج کا ہی جزوِ لاینفک نظر آتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ان قرآنی آیات کی تشریح کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ کیا ہے:

> ''یعنی آخرت کا عذاب تو عبث مانگتے ہیں۔ اس عذاب میں تو پڑے ہی ہیں۔ یہ کفر اور یہ برے کام مرنے پر نظر آوے گا کہ دوزخ کی آگ ہے جلاتی۔''

(۲۴) موت کیا ہے؟

(۱) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الزمر: ۴۲)

''اللہ جانوں کو اُن کی موت کے وقت کھینچ لیتا ہے اور جو نہ مریں اُنہیں ان کے سونے میں۔

https://telegram.me/ilmokiab

پھر جسے موت کا حکم فرمایا اسے روک رکھتا ہے اور دوسروں کو ایک مقرر وقت کے لیے بھیج دیتا ہے۔ اس میں سوچنے والوں کے لیے پتے (نشانیاں) ہیں۔''

موت روح یا جان کا خاتمہ نہیں ہے۔ صرف جسم سے اس کے قطع تعلق کا نام ہے۔ جب کسی کے مر جانے کا وقت آ جاتا ہے تو خدا اس کی روح کو اس جسم خاکی سے الگ کر کے اسے روک رکھتا ہے۔ اس کو جسم کی طرف واپس نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرمایا، جسے موت کا حکم فرمایا اسے روک رکھتا ہے۔ اس سے روح نیست و نابود نہیں ہو جاتی صرف جسم سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ روح باقی رہتی ہے اور اپنی پوری شخصیت کے ساتھ باقی رہتی ہے۔

جسم کے بغیر روح کی کیا حالت ہوتی ہے؟ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا سرے سے آدمی کو کوئی تجربہ نہ ہوتا ہو، جن لوگوں کی موت کا ابھی وقت نہیں آیا موت کا تجربہ انہیں بھی کرایا جاتا ہے۔ خدا ان کے سونے میں ان کی روح قبض کرتا ہے۔ سونے میں روح جسم سے وہ کام نہیں لیتی ہے جو وہ بیداری کی حالت میں لیتی ہے۔ وہ سنتی اور دیکھتی ہے لیکن اس کے لیے وہ جسمانی کان اور آنکھ استعمال نہیں کرتی، وہ سفر کرتی ہے لیکن جسم بستر پر پڑا رہتا ہے۔

لیکن یہ انسان کی غفلت ہے وہ اس پر غور نہیں کرتا اور اپنے کو جسم ہی سمجھتا ہے اور جسم سے ہٹ کر اپنی ذات کا تصور نہیں کرتا۔ وہ اپنی روح کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ روح کیا ہے؟ اسے پورے طور پر سمجھنا انسان کے لیے مشکل ہے لیکن ہم اسے شعور اور ہوش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ شعور یا ہوش روح کی خاص صفت ہے۔ شعور اور ہوش کا تعلق روح سے ہی ہے اور یہ بہت قریبی تعلق ہے۔ شعور کا تعلق روح سے ہے اور خدا کے سوا کسی دوسری چیز کے سبب سے یہ وجود میں نہیں آتی۔ شعور کوئی مادّی کرشمہ ہرگز نہیں ہے۔ روح بہ ذاتِ خود آزاد ذات اور شخصیت ہے لیکن آدمی جسمانی علائق میں کچھ اس طرح گرفتار رہتا ہے کہ اسے اپنی اصل حقیقت اور اصلیت کا خیال تک نہیں آتا۔

روح کی یہ حیثیت اور موت کی جو حقیقت قرآن میں بیان ہوتی ہے اس سے زندگی کے روشن امکانات سامنے آتے ہیں۔ پھر انسان کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اپنی خبر ملنے کے بعد پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔ آدمی کے اندر ایک شان استغنا پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ

https://telegram.me/ilmokiab

خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ خدا کا وفادار بندہ ہے تو اس کا خدا اسے ضائع نہیں کرے گا بلکہ وہ اسے اعلیٰ ترین حیات سے نوازے گا۔ پھر نہ بڑھاپے کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی تکلیف اور رنج سے سابقہ پیش آئے گا۔ اپنی پہچان ہونے کے بعد انسان جان لیتا ہے کہ خدا نے اسے محض خاک نہیں بنایا ہے بلکہ اسے وہ کچھ بنا تا ہے، جس کے مقابلے میں زمین و آسمان کی ساری مادّی چیزیں ہیچ ہیں۔ خدا نے اسے حیات جاوداں عطا کی ہے۔ وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے اور بہتر امکانات کی طرف کوچ کرتا ہے۔ صرف جسم خاکی سے اس کی وابستگی ختم ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''نیند میں ہر روز جان کھینچتا ہے پھر بھیجتا ہے۔ یہی نشان ہے آخرت کا۔ معلوم ہوا نیند میں جان کھنچتی ہے جیسے موت میں۔ اگر نیند میں کھنچ کر رہ گئی وہی موت ہے۔ مگر یہ جان وہ ہے جسے ہوش کہتے ہیں (اور اصل یہی ہے) اور ایک جان جس سے دم چلتا ہے اور نبضیں اچھلتی ہیں اور کھانا ہضم ہوتا ہے وہ روح موت سے پہلے نہیں کھنچتی۔''

(۲) هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلاً مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (المومن:۶۷)

> ''وہی ہے جس نے بنایا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر لوتھڑا سے پھر تمہیں نکالتا ہے کہ بچے ہوتے ہو، پھر باقی رکھتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو پھر تا کہ بوڑھے ہو اور کوئی تم میں اس سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور تا کہ تم مدتِ مقرر کو پہنچ جاؤ اور تا کہ تم سمجھو۔''

انسان اگر پیدائش ہی میں غور و فکر سے کام لے تو حقیقت کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہو سکتی۔ پھر نہ وہ خدا کا منکر ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کا انکار کر سکتا ہے۔ انسان کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ اس طرح پیش نہیں آتا کہ وہ بالترتیب کئی ایسے حادثات اور واقعات کا مجموعہ ہو جن میں باہم غیر معمولی اور حیرت انگیز حکیمانہ ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ اچانک کوئی واقعہ پیش آ جائے خواہ وہ مفید مطلب بھی ہو تو کہہ سکتا ہے کہ ایسا اتفاق سے ہو گیا۔ لیکن کوئی واقعہ اگر نو مہینے کی لمبی مدت تک وسیع ہو کر اس طرح پیش آئے کہ ایک حقیر پانی کی بوند ایک جیتے جاگتے بچے

https://telegram.me/ilmokiab

کی شکل اختیار کرے تو اسے کس طرح اتفاق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے پیچھے کسی قادر مطلق ہستی کا ہاتھ ہے۔ یہ ہرگز اندھی بہری مادّی طاقت کا کرشمہ نہیں ہوسکتا۔

اگر انسان اپنی پیدائش میں غور وفکر سے کام لے تو آخرت کی زندگی پر بھی اُسے یقین آ سکتا ہے۔ آخرت کا انکار آدمی اسی لیے تو کرتا ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی بات ہے۔ یہ توان ہونی ہے۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے وہ اپنی پیدائش کو نہیں دیکھتا۔ آخر کون سی ان ہونی بات ہے جو اس نے ہوتے نہیں دیکھی۔ کیا یہ بات کم اَن ہونی ہے کہ خاک ملی پانی کو حقیر بوند جسے نطفہ کہتے ہیں، خون جلد اور گوشت کی شکل اختیار کر لے۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں ایسی حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو کہ ایک مدت کے بعد وہ ایک جیتا جاگتا بچہ بن کر سامنے آئے جس میں آنکھیں بھی ہوں اور کان بھی ہوں، دل اور دماغ بھی ہو اور ہاتھ پیر اور دیگر اعضا بھی ہوں۔ پھر وہ دنیا کی ہوا اور روشنی میں بڑھ کر جوان ہو اور مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دینے کا اہل ثابت ہو۔

آخر یہ اَن ہونی کیسے ہو رہی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ موت کے بعد کسی کے لیے زندگی کا امکان نہیں رہتا خود موجودہ زندگی کے مشاہدے کے خلاف بات ہے۔ یقینی طور پر یہ دعویٰ کرنا کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جو غیر علمی ہے۔ پہلے سائنس داں کہتے تھے کہ دنیا مادّی چیزوں سے بنی ہے اور مادّہ کی خاصیت معلوم اور متعین ہے۔ اس لیے کسی بھی معاملہ میں یقینی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن ہمیں حاصل ہے۔ لیکن اب صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ اب سائنس داں تیقن (Certainty) کی بات نہ کر کے غیر متیقن (Uncertainty) کا نیا اصول ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اب ان کی وہ پوزیشن برقرار نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ایسا ہی ہوگا یا ایسا نہیں ہوگا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ محض امکان (Probability) کی بات ہے۔ اس سے زیادہ اب وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جدید تحقیقات نے ان کے پرانے دعوے کو غلط ثابت کر دیا۔ پہلے مادہ بھروسہ کے لائق سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ایک طرح کا تیقن تھا لیکن ایٹم کے جو آخری ذرّات حاصل ہوئے ہیں ان کا عملی رویہ غیر متعین ہے۔ اس کے بارے میں پہلے سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے وہ کہتے رہے ہیں کہ ہر چیز متعین ہے لیکن معلوم ہوا کہ

https://telegram.me/ilmokiab

یہ بات تو بہت اوپری تھی۔

اب سائنس کا اصرار یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو ماننے کے لیے امکان واحتمال (Probability) سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ہے۔ امکان کے سائنٹفک اصول (Law of probability) کو دیکھتے ہوئے اب نہیں کہا جاسکتا کہ زندگی بعد موت کا نظریہ کوئی غیر سائنٹفک نظریہ ہے۔ جب موت کے بعد زندگی کا امکان ہے اور اس کی ضرورت ہے اور جب کہ اس امکان کو بروئے کار لانے کی خدا خبر بھی دے رہا ہے تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے جب ہم شاہ عبد القادرؒ کو آج سے بہت پہلے آج کے جدید ترین استدلال سے کام لیتے دیکھتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''یعنی اتنے احوال تم پر گزرے شاید ایک حال اور بھی گزرے وہ مرکر جینا۔''

مطلب یہ ہے کہ تم مختلف مرحلوں سے گزر چکے ہو۔ انسانی صورت اختیار کرنے سے پہلے تم خاک، نطفہ اور لوتھڑا رہ چکے ہو۔ پھر اس کے بعد تم جوان ہوتے ہو۔ پھر تم پر بڑھاپا طاری ہوتا ہے اور پھر موت آتی ہے۔ پھر اگر اس میں ایک مرحلہ کا اضافہ ہو جائے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ زندگی بعد موت کے مرحلے کے امکان کو تم کیوں نہیں مانتے۔

شاہ صاحب نے جو فقرہ استعمال کیا ہے اس میں لفظ ''شاید'' کوئی شک اور شبہ کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ امکان کو ظاہر کرنے والا لفظ ہے۔ شاہ صاحبؒ یہاں قانون امکان سے کام لیتے نظر آتے ہیں جو دورِ جدید کا ایک تسلیم شدہ سائنٹفک اصول ہے۔

(۲۵) حساس دل کی یافت

(۱) وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ○ (الانعام:۹۸)

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک جان سے پھر کہیں تمہیں ٹھہراؤ ہے اور کہیں سپرد ہونا۔ ہم نے سمجھنے والے لوگوں کے لیے یہ نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں۔''

کوئی جگہ آدمی کے لیے قرار و مستقر آخرت کی ہوتی ہے اور کوئی جگہ محض کچھ تھوڑے

https://telegram.me/ilmokiab

عرصے کے لیے ہوتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی قرار گاہ نہیں ہے۔ صرف کچھ دنوں کے لیے وہاں رکھا گیا ہے۔ اصل مستقر ہے اس لیے اس کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ جہاں وہ تھوڑے دنوں کے لیے رکھا جاتا ہے وہ مستقر آخرت نہیں ہے مستودع ہے۔ گویا امانتاً وہ کچھ دنوں کے لیے وہاں سونپا گیا ہے۔ زمین پر قدم رکھنے سے پیشتر انسان ماں کے پیٹ میں سونپا جاتا ہے تاکہ زمین پر جو رحم مادر کی نسبت سے مستقر ہے وہ قدم رکھنے کے لائق ہو سکے۔ رحم مادر نطفہ کے لیے تو قرار گاہ ہے لیکن انسان کے لیے اس کی حیثیت مستودع کی ہے۔

ماں کے شکم میں رہ کر جنین کے اثرات قبول کرتا ہے، اس کے وجود اور زمین کے ماحول کے درمیان مطابقت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ماں کے پیٹ سے باہر آ کر زندگی گزار سکے اور زمین اس کے لیے قرار گاہ بن سکے۔

لیکن یہ زمین بھی ایک دوسرے پہلو سے یعنی آخرت کے اعتبار سے اصل قرار گاہ نہیں ہے، مستودع ہے۔ اگر یہ اصل قرار گاہ ہوتی تو انسان یہاں سے رخصت کیوں ہوتا۔ پھر دنیا کی زندگی میں قبر یعنی برزخ کی زندگی شامل کر کے دیکھیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ انسان کی اصل قرار گاہ بہت ہی اعلیٰ وارفع ہوگی۔ اس قرار گاہ یا مستقر کے لائق ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ انسان کو زمین کی پشت سے لے کر عالم برزخ تک کے مرحلے پیش آئیں۔

جس طرح رحم مادر میں بچہ زمین سے بے تعلق نہیں رہتا بلکہ بواسطہ یا بے واسطہ زمین کے اثرات سے مستفیض ہو کر زمین پر رہنے کے لائق ہوتا ہے۔ ماں کے شکم میں جو غذا اُسے ملتی ہے اصلاً اس کا تعلق زمین سے ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی جسمانی ساخت میں ارضی ماحول ہی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، آنکھ، کان، ناک، پھیپھڑے اس کی ارضی ضروریات ہیں یہ اعضاء اسے ماں کے پیٹ ہی میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کا اصل تعلق شکم مادر سے نہیں زمین کی فضا سے ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر انسان کو دیکھنا، سننا، دوڑنا، بھاگنا اور سانس لینا ہوتا ہے۔

پھر آدمی کو زمین ہی پر ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ اسے عالم آخرت کی طرف بڑھنا ہے۔ اس لیے لازماً دنیا کی حیثیت بھی رحم مادر کی طرح مستودع کی ہے۔ دنیا تو عارضی مستقر ہے۔ آخرت کے اعتبار سے وہ بھی مستودع ہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا میں آخرت کے زیر اثر

https://telegram.me/ilmokiab

ہو۔ پھر برزخ اسے آخرت سے اور زیادہ قریب اور مانوس اثر کرتا ہے۔

آخرت حقائق اور حیات کی معنویت کا سیدھا اظہار ہے۔ اس کا سامنا تیاری کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے تو آدمی جسم لے کر آتا ہے، لیکن دنیا سے وہ جسم لے کر نہیں جاتا۔ یہاں سے اس کی روح اپنی اس شخصیت کے ساتھ رخصت ہوتی ہے، جس کی تعمیر انسان دنیا کی زندگی میں کرتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں انسانی شخصیت کس طرح آخرت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اس بات کو خواہ ہم پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ آدمی کی تیاری جس کا اصل تعلق آخرت کے مستقر سے ہے وہ اس کی سیرت یا کردار ہے، جس میں اخلاقی و روحانی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ آدمی دنیا میں اخلاق اور روحانیت کی حیثیت سے اونچا اٹھتا ہے یا وہ اخلاق اور اپنے روحانی تقاضوں کو نظر انداز کر کے پستی میں گرتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے بلند ہوسکا تو آخرت کی دنیا اس کے لیے بہترین مستقر ثابت ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر وہاں وہ سخت عذاب اور مصائب سے دوچار ہوگا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے اس حالت میں پیدا ہو کہ اس کے جسمانی اعضاء ٹھیک سے نہ بن سکے ہوں۔ نہ اس کی آنکھیں درست ہوں اور نہ اس کے ہاتھ پیر ٹھیک ہوں۔ ظاہر ہے ایسے بچے کے لیے زمین میں قدم رکھنا مصیبت کے سوا کچھ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح جن لوگوں کی زندگی میں آخرت کے تقاضوں کی رعایت نہیں پائی جاتی جو محض دنیا ہی کو سب کچھ مان کر جیتے ہیں اور خدا کے منصوبے کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہیں، ان کی زندگی آخرت میں ایک عذاب کے سوا کچھ نہ ہوگی اور وہ اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نہ پاسکیں گے۔

اس طرح یہ مستودع اور مستقر جو شکم مادر اور سطح ارضی کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جن کے باہمی تعلق کو ہم بہ خوبی جانتے ہیں۔ ہمارے لیے ایک بڑی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمیں اپنے مستقر کو نہ بھولنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اصل مستقر کی طرف جانا ہے۔ اس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کو کچھ نہیں کرنا ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں ہماری حیثیت بچے سے زیادہ ہوتی ہے۔ آخرت کی تیاری میں ہمیں اپنا بھی حصہ ادا کرنا ہوگا۔

قرآن کی یہ امتیازی خوبی ہے کہ وہ نہایت واضح ہے۔ لیکن اس میں بہت سارے نازک

https://telegram.me/ilmokiab

ترین اشارے بھی پائے جاتے ہیں، جن کا احاطہ کسی فردِ بشر کے لیے ممکن نہیں ہے۔ قرآن کی آواز میں کتنی ہی معنوی لہریں اٹھتی ہیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ ایک لہر دوسری لہر کو پیدا کر جاتی ہے۔ یہ ہماری قوتِ فہم اور قوتِ ادراک پر منحصر ہے کہ ہم کہاں تک قرآن کے اشاروں کو سمجھ پاتے ہیں۔ شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے قرآن کے کتنے ہی اشاروں کو سمجھا ہے اور مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ''اول سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کو آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے۔ پھر آ کر ٹھہرتا ہے دنیا میں۔ پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے۔ پھر جا ٹھہرے گا جنت یا دوزخ میں۔''

(۲) فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ۝ وَ نَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۝ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا ۚ (اَلصّٰفّٰت: ۱۰۳-۱۰۵)

> ''دونوں نے حکم مانا اور گرایا اسے ماتھے کے بل اور ہم نے اس کو پکارا کہ اے ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔''

یہاں اس بے مثال قربانی کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی جناب میں پیش کی تھی۔ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کو تیار ہو گئے۔ بیٹا بھی خدا کے لیے قربان ہو جانے کو تیار ہو گیا۔ کیا عالم تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لختِ جگر حضرت اسمٰعیل کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر لٹایا اور چھری گردن پر رکھی۔ یہ دل گداز منظر زمین و آسمان نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ اسلام کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی خدا کی خوشی کے مقابلے میں کسی بھی چیز کو ترجیح نہ دے۔ یہاں تک کہ اپنی اور اپنے عزیز سے عزیز بیٹے کی جان کو بھی خدا کے لیے قربان کرنے کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہو۔

ان آیتوں پر غور کریں، یہاں یہ تو فرمایا گیا کہ جب دونوں باپ بیٹے خدا کی مرضی کے آگے جھک گئے اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے زمین پر لٹایا، لیکن یہ نہ بتایا گیا کہ جب ایسا انھوں نے کیا تو پھر کیا ہوا؟ بلکہ یہ چھوڑ کر آگے کا حصہ بیان فرمایا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آواز دی کہ 'تم نے اپنے خواب کو کہ تم اپنے بیٹے کو قربان کر رہے ہو' سچ کر

https://telegram.me/ilmokiab

دکھایا۔ یہاں موصول تو ہے لیکن اس کے صلہ کو محذوف رکھا گیا ہے۔ یہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس خلا کو اتنی قوت احساس سے خود پر کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن میں ایک بڑا حصہ ایسا پایا جاتا ہے جہاں الفاظ کھو گئے ہیں، صرف معنی رہ گئے ہیں۔ الفاظ نہیں ہیں۔ اس سے ایک طرف قرآن کی تاثیر میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسری طرف وسیع اور گہرے معانی کو قرآن نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے صاف الفاظ استعمال نہیں کیے گئے۔ کتنے ہی معانی اور حقائق ہیں، جن کے متحمل الفاظ نہیں ہو پاتے۔ وہ اتنے وسیع اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر الفاظ کے ذریعے سے اُن کا احاطہ کرنا چاہیں تو دفتر کے دفتر بھی ناکافی ثابت ہوں۔

آیت زیر غور میں محذوف کو بعض لوگوں نے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''تو جب دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھی اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا اس وقت کا حال نہ پوچھو۔''

لیکن پھر بھی حال پوشیدہ رہا جملہ بھلے ہی کاغذ پر مکمل ہو گیا ہو، قرآن چاہتا ہے کہ اس نے جو خلا رکھا ہے وہ قاری یا سامع کے ذہن اور دل کے ذریعے سے پر ہو۔ جس فقرے کو پورا کیے بغیر چھوڑ دیا وہ کاغذ یا زبان پر نہیں، انسان کے دل میں جا کر پورا ہو اور اس طرح انسان کا دل بھی قرآن کا ایک حصہ بن جائے۔ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مقامات آئے ہیں وہ بلا وجہ نہیں ہیں۔ شاہ صاحبؒ اس آیت زیر غور کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''آگے اللہ نے نہیں فرمایا کہ کیا گزرا یعنی کہنے میں نہیں آتا کہ جو حال گزرا اس کے دل پر اور فرشتوں پر۔''

(۲۶) مشاہدہ و مطالعہ

(۱) وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝

(الروم:۲۱)

''اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے

https://telegram.me/ilmokiab

پیدا فرمائے تاکہ تم ان کے پاس آرام وسکون حاصل کرسکو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں بڑی نشانیاں ہیں۔"

قرآن انسانوں سے محض تصوراتی اور خیالی باتیں نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی جانی پہچانی چیزوں کو جن کے وجود کے بارے میں کسی کو کوئی شبہ ہی نہیں ہوسکتا سامنے پیش کرتا ہے اور انہی پر اپنی بنائے استدلال رکھتا ہے۔ ان چیزوں کی وہ ایسی توجیہ وتوضیح (Interpretation) کرتا ہے کہ ہر چیز بامعنی اور بامقصد دکھائی دینے لگتی ہے۔ آدمی کو اس کے اپنے دل میں اٹھنے والے تمام ہی سوالوں کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔ عام فلسفوں اور قرآن کے طرزِ استدلال میں یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے حالاں کہ اپنے خاص طرزِ استدلال کو اختیار کرنے کی قرآن اپنے پیرووں کو پوری تربیت دیتا ہے۔ قرآن حقائق ہستی کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس کی جیتی جاگتی نظریں اور نمونے (Samples) پیش کرتا ہے البتہ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر مشاہدہ اور مطالعہ کی قوت موجود ہو۔ کسی چیز کے باریک سے باریک اور لطیف تر پہلو بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوں۔ قرآن کی بعض آیات کی تشریحات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کے حامل تھے۔ وہ نہایت باریکی کے ساتھ چیزوں کو دیکھتے اور ان سے نتائج اخذ کرتے نظر آتے ہیں۔ آیت زیرِ غور کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی غور وفکر اور قوتِ مشاہدہ کی ایک واضح مثال ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسان کو اگر جوڑے کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے تو اس کی غرض و غایت محض نسل انسانی کی بقا ہی نہیں ہے، بلکہ بقائے نسل کے علاوہ اس سے مقصد ایسے سکون اور دل کے ٹھیراؤ کا حصول بھی ہے جس سے زندگی کی پریشانیاں اور بے چینیاں دور ہوں۔ یہ خصوصیت صرف انسان کی زندگی میں ہے۔ بقائے نسل کا اہتمام وانتظام تو حیوانات ونباتات تک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن سکون اور مودت ورحمت کی خصوصیت صرف انسان کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ دنیا میں تبارک وتعالیٰ نے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے تخلیقی نمونے پیش کردیے ہیں تاکہ خدا کی اس خصوصی نوازش کو جو اس نے انسانوں پر کی ہے انسان محسوس کرے اور خدا کا شکر گزار ہو۔

خدا نسل کو بغیر جوڑے کے بھی چلا سکنے پر قادر تھا۔ چناں چہ درختوں کا معاملہ بالعموم ایسا

https://telegram.me/ilmokiab

ہی ہے۔ اکثر درخت نر اور مادہ دونوں خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں پھول بھی آتے ہیں اور پھول کے بعد ان میں پھل بھی لگتے ہیں۔ اس طرح ان کی بقا کا سامان فراہم ہوتا رہتا ہے۔

حیوانات میں نر اور مادہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان دو سے ان کی نسل چلتی ہے۔ لیکن جانوروں کے لیے کوئی خاص جوڑا نہیں ہوتا۔ جانور اپنی نسل کے کسی بھی جوڑے سے مل کر اپنی نسل کی بقا کا سامان کرتا ہے۔ انسان کا معاملہ ان سب سے ممتاز اور الگ ہے۔ انسان کے لیے جنسی آزادی کو پسند نہیں کیا گیا۔ بلکہ فطرت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنا خاص جوڑا مقرر کر کے اس کے ساتھ زندگی بسر کرے تاکہ نسل کی بقا کے علاوہ اسے وہ چین وسکون اور محبت و ہمدردی بھی حاصل ہو سکے جس کی اس کی فطرت متقاضی ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ معاشرہ اور خاندان وجود میں آ سکتا ہے اور تہذیب وتمدن کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ نے درخت کی نسل ایک سے چلائی اور جانور کی نسل دو سے۔ پھر بعضے جانور کا جوڑا مقرر نہیں اور بعضوں کا مقرر ٹھیرایا۔ اس میں نسل کے سوا اُنسیت اور چین ہے اور پیار اور محبت تاکہ جہان کی بستی ہو۔ جو کوئی جوڑا مقرر نہ کرے یعنی زنا کرے نکاح نہ کرے، وہ انسان سے حیوان ہوا۔''

نکاح کی رسم حیوانوں میں نہیں ہے۔ اگر انسان بھی حیوانوں کی روش اختیار کرے گا تو وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ صاحبؒ کا یہ طرزِ استدلال ان کی دقتِ نظر اور قوتِ مشاہدہ کی ایک واضح مثال ہے۔

(۲) وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ۝ (الروم:۳۳)

''جب لوگوں کو سختی پیش آتی ہے تو وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتا ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانے لگتا ہے۔''

شاہ صاحبؒ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ انسان کے بارے میں ہمارا مطالعہ ناقص رہے گا جب تک ہم اس کی نفسیات کا جائزہ خوشی، غم، تکلیف، گھبراہٹ وغیرہ تمام حالتوں

https://telegram.me/ilmokiab

میں نہ لیں۔ انسان کی کتنی نفسیاتی حقیقتیں ہیں جو عام حالات میں نمایاں نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن مخصوص حالات میں وہ بھی ہمارے تجربے میں آجاتی ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ البرٹ آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ روشنی جب کسی تارے کے پاس سے ہوکر گزرتی ہے تو اس تارے کی کشش کی وجہ سے وہ کچھ مڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورج ایک تارہ ہے۔ اس سے پرے بھی بہت سے تارے ہیں۔ جب ان تاروں کی روشنی سورج کے پاس سے گزرتی ہے تو سورج کی کشش کی وجہ سے وہ سیدھی چلنے کی بہ نسبت سورج کی طرف تھوڑا مڑ جاتی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سورج سے اوپر جو تارے ہیں وہ ہمیں اصل محل وقوع سے ہمیں کچھ ہٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سائنس دانوں نے اس کا تجربہ کرنا چاہا، لیکن عام حالات میں اس کا تجربہ کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۱۹ء میں مکمل سورج گرہن لگنے والا تھا اور یہ معلوم تھا کہ زمین پر مکمل سورج گرہن صرف دو مقام پر دکھائی دے گا۔ ایک برازیل کے ایک خاص مقام پر اور دوسرے افریقہ کے گنی خلیج کے ایک جزیرے میں۔ برطانیہ کے مشہور سائنسی ادارہ رائل سوسائٹی نے دونوں ہی جگہوں پر اپنے آدمیوں کی دو ٹیم بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے لاکھوں روپے جمع کیے گئے۔ گرہن صرف دو منٹ کے لیے ہی لگنے والا تھا۔ اس لیے سائنس دانوں کو بڑی مستعدی سے اپنا کام کرنا تھا۔ گرہن لگنے پر سائنس دانوں نے دوربین کے ذریعے سے تاروں کے بہت سے فوٹو لیے۔ جن کے مطالعے سے آئن اسٹائن کا نظریہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ رائل سوسائٹی نے یہ فوٹو آئن اسٹائن کو بھی بھیجے۔

ٹھیک یہی حال انسان کی بھی بعض نفسیات کا ہے۔ ان کا مطالعہ بھی اسی وقت ہو پاتا ہے جب انسان کو زندگی کے کسی گرہن سے سابقہ پیش آتا ہے، ورنہ عام حالات میں ان کا ہمارے تجربے میں آنا ممکن نہیں ہوتا۔ مصائب اور سخت حالات میں انسان کے اندر ایک ایسی قادر مطلق ہستی کی یاد ابھر آتی ہے جس کی عام حالات میں وہ کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مصیبت میں پتہ چلتا ہے کہ انسانی جبلت صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ انسان کے اندر خوف، اپنے تحفظ وغیرہ کے محض ظاہری داعیات موجود ہیں یا وہ محض جبلی طور پر نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی سمجھتا ہے، بلکہ اس کی جبلت میں ایک خدا سے تعلق اور اس کی جانب رجوع ہونے کا داعیہ بھی شامل ہے۔ جب تک

https://telegram.me/ilmokiab

انسان خدا کی جانب رجوع ہوکر اپنے کو اس کے حوالے نہ کردے۔ اس کی روح تشنہ ہی رہتی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''جیسے بھلے کام ہر انسان کی جبلت پہچانتی ہے۔ اللہ کی طرف رجوع ہونا بھی ہر ایک کی جبلت جانتی ہے۔ ڈر کے وقت کھل جاتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ ڈر اور خوف کے موقع پر یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کی جبلت میں رجوع الی اللہ شامل ہے۔ عام حالات میں خواہ کسی کو اس کا اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن مصیبت میں اس کا تجربہ لازم ہوتا ہے۔

(۲۷) زمانہ کی حقیقت

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ○ (الجاثیۃ:۲۴)

''انھوں نے کہا کہ زندگی تو ہماری بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ ہمارا یہ مرنا اور جینا تو لگا ہوا ہے۔ ہم بس زمانے کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اُنہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں۔ وہ تو محض اٹکل بازی سے کام لیتے ہیں۔''

اس آیت کے ذیل میں شاہ صاحب نے نہایت لطیف بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ منکرین حقائق اور واقعات کو زمانے کے سر مڑھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی کوتاہ نظری ہے ورنہ زمانہ کا نام لینے سے حقائق کی توجیہ و تشریح نہیں ہو جاتی۔ زمانے کے اختیار میں موت اور حیات تو کیا ہوتی زمانہ خود ایک اضافی چیز ہے۔ زمانے کی طرف منسوب کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کے ہاتھ میں عالم کی باگ ڈور نہیں۔ اسے خود اپنی حیات اور موت پر بھی کوئی اختیار نہیں ورنہ زمانہ کا محض نام لے دینے سے حقیقت کی تشریح نہیں ہو جاتی۔ جس زمانہ اور قوت کو ہم جانتے ہیں، اس کے قبضے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ زمین اور آسمان میں جس کا تصرف ہے، جو ہماری حیات اور موت کا مالک ہے وہ تو کوئی اور ہی ہو سکتا ہے جو ہمارے ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔ نظام کائنات اور زندگی اسی کے اختیار میں ہے۔ جب زمانہ کی طرف ہر چیز منسوب

https://telegram.me/ilmokiab

کرنے سے حقیقت کی وضاحت نہیں ہوتی تو زمانہ پر اصرار نافہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ جب زمانے کا نام لینے سے حقائق کی وضاحت نہیں ہوتی تو پھر سیدھے کیوں نہ خدا ہی کا نام لیا جائے، کیوں کہ خدا ایک قادر مطلق ہستی کا نام ہے جو نظامِ کائنات کو چلا رہی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دہر یعنی زمانہ اللہ ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں کو لوگ زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ سب کی سب خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ یہ گردش لیل ونہار اور تغیرات عالم خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے جامع اور پرمغز الفاظ ملاحظہ ہوں:

"زمانہ نام ہے دہر کا۔ وہ کچھ کرنے والا نہیں۔ مگر کسی اور چیز کو کہتے ہیں جو معلوم نہیں ہوتی اور دنیا میں تصرف اس کا چلتا ہے۔ پھر اللہ ہی کو کیوں نہ سمجھیں۔ ایسے ہی معنیٰ پر حدیث میں آیا ہے کہ دہر اللہ ہے اس کو برا نہ کہیے۔"

(۲۸) مسئلۂ تقدیر

(۱) فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف:۱۳۱)

"جب ان کو اچھی حالت پیش آتی ہے، کہتے ہیں: یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر کوئی ناگوار حالت اُنہیں پیش آتی ہے تو اسے موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی بدشگونی قرار دیتے ہیں۔ جان لو اللہ کی بدشگونی تو اللہ ہی کے پاس ہے، لیکن بہتیرے ان میں جانتے نہیں۔"

اس سلسلے میں بھی شاہ صاحب نے ایک لطیف بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منکرین نے جب یہ کہا کہ ہمیں جو ناگوار حالت پیش آتی ہے وہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست کے سبب پیش آتی ہے تو اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ شومی تو منکرین کے اپنے کفر کے سبب ہے۔ بلکہ اس حقیقت کا اظہار فرمایا گیا کہ عام حالات میں دنیا میں جو آرام وراحت یا پریشانیاں پیش آتی ہیں اُن کا تعلق درحقیقت تقدیر الٰہی سے ہے۔ تقدیر الٰہی کے تحت کبھی خوشیاں میسر آتی ہیں اور کبھی انسان پر سخت دن گزرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفر کے باوجود دنیا میں منکروں کو عیش

https://telegram.me/ilmokiab

کی فراوانی میسر آ جاتی ہے۔ لیکن آخرت میں ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ وہاں تو آدمی کی نیکی اور بدی کا اثر ظاہر ہوگا۔ نیک عمل کرنے والے اہل ایمان وہاں عیش و راحت میں ہوں گے۔ منکرین وہاں گرفتارِ عذاب ہوں گے۔ اس لیے آدمی کو تقدیرِ الٰہی پر راضی ہو کر آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ منکروں کی خوش حالی اور عیش کو دیکھ کر کسی تردد میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ خوش حالی تو ان کے حصے کی ہے جو ان کو حاصل ہوگی ہی۔ اس میں ان کی آزمائش بھی ہے۔ ان کی خوش حالی کوئی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> ''شومی قسمت بد ہے سو اللہ کی تقدیر سے ہے، بھلائی اور برائی کا اثر ہوگا آخرت میں۔ اس کا جواب یہ نہ فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی۔ کیوں کہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں۔ اصل حقیقت تھی سو فرمائی کہ دنیا کے احوال موقوف بہ تقدیر ہیں۔''

(۲) يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ○ (الرعد:۳۹)

> ''اللہ جو چاہتا ہے مٹا ڈالتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔''

ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسباب فراہم کیے ہیں۔ اسباب کے بغیر کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ بات اور ہے کہ ہر چیز کے لیے کچھ اسباب بالکل ظاہر ہوتے ہیں، جن کا علم ہر ایک کو ہوتا ہے اور کچھ اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسباب کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس سے خدا بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت اس سائنس داں کی طرح نہیں ہے جسے مثال کے طور پر ہائیڈروجن کی طاقت کا اندازہ نہ ہو اور اس کے لیے تجربات کر رہا ہو۔ اللہ کو تو ہر چیز کی قوت اور تاثیر معلوم ہے۔ وہ حسبِ ضرورت چیزوں کی تاثیر میں کمی بیشی بھی کر سکتا ہے۔ جیسے کہ اس نے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی کر دی تھی۔ لیکن چیزیں ایک دوسرے پہلو سے بھی خدا کے علم میں ہیں، جن میں کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی قدرت اور علم کے دائرے سے کوئی بھی چیز باہر نہیں ہو سکتی۔ اسے وقوع میں آنے سے پہلے ہی سے ہر چیز کا علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں پہلے سے جانتا ہے کہ وہ عملاً کام آ سکے گی یا نہیں یا کام آئے گی تو کس حد تک کام آئے گی۔ تقدیرِ الٰہی کا یہ پہلو ایسا ہے کہ اس میں کوئی فرق واقع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بندے کو خدا نے جو ارادہ و عمل کی آزادی دے رکھی ہے، جس کے استعمال کرنے میں وہ آزاد ہے۔ لیکن یہ آزادی بھی تقدیرِ الٰہی کے تحت حاصل ہوئی ہے۔ خدا پہلے سے جانتا ہے کہ کون

https://telegram.me/ilmokiab

شخص اس آزادی کو غلط طور پر استعمال کر کے خدا کا نافرمان بنے گا اور کون ارادہ وعمل کی آزادی کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے خدا کا فرماں بردار بندہ بنے گا۔ خدا نے اس علم کے باوجود کہ کون دنیا میں کیا بن کر رہے گا لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون لوگ دنیا میں اپنے ارادہ وعمل کی آزادی کو صحیح طور پر استعمال کر کے جنت میں داخل کیے جانے کے مستحق ہوں گے۔ ایسے لوگوں کو اللہ نے یہ جانتے ہوئے پیدا فرمایا کہ یہ جنت میں جانے والے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے اُنہیں جنت ہی کے لیے پیدا فرمایا۔ اسی طرح خدا ان لوگوں سے بھی پہلے سے واقف ہوتا ہے جو اپنی بے کرداری اور بداعمالی کی وجہ سے جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ ان کے بارے میں اس قطعی علم کے باوجود وہ دوزخ میں جائیں گے۔ خدا نے اُنہیں پیدا کیا۔ اپنے علم کی بنا پر خدا کو ایسے لوگوں سے کسی حالت میں کوئی اچھی توقع نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی اس نے انہیں پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ دوزخ ہی میں جانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے:

ان اللّٰہ خلق للجنۃ اھلا خلقھم لھا و ھم فی اصلاب اٰبائھم و خلق للنار اھلاً خلقھم لھا و ھم فی اصلاب اٰبائھم (مسلم)

”اللہ نے جنت کے لیے کچھ لوگوں کو پیدا فرمایا حالاں کہ ابھی وہ اپنے باپوں کی پشت ہی میں تھے (زمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا)۔ اسی طرح اُس نے کچھ لوگوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا حالاں کہ وہ بھی ابھی اپنے باپوں کی پشت ہی میں تھے۔“

شاہ صاحبؒ نے ان باتوں کو نہایت صحیح اور سادہ الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

”دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے۔ بعض ظاہر ہیں اور بعض چھپے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے۔ جب چاہے اس کی تاثیر اندازے سے کم زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے۔ اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے وہ ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔“

(۲۹) لطیف استدلال

(۱) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهُ سٰجِدِيْنَ ۝ (الحجر:۲۹)

https://telegram.me/ilmokiab

''پس جب اس (آدم) کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونکوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑو۔''

اس مٹی کے پتلے میں خدا نے اپنی روح پھونکی۔ یعنی پتلے میں روح کہیں اور سے فراہم نہیں کی بلکہ یہ خدا کی پھونکی ہوئی روح ہے۔ خدا نے کچھ اپنی صفات کا پرتو ڈالا اور جیتا جاگتا باشعور انسان وجود میں آ گیا۔ اس طرح انسان خود خدا کے وجود پر ایک واضح دلیل ہے۔ کائنات کے مطالعہ سے ایسا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کسی بڑی طاقت کی کارفرمائی ہے۔ ورنہ اتنا عظیم کارخانہ اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔ یہ کائنات اتنی گہری اور نازک ریاضیاتی اور حکیمانہ تدبیر و نظم کے ساتھ چل رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کائنات میں ایک کہکشاں دوسری کہکشاں کے درمیان سے ہو کر گزر جاتی ہے لیکن دو ستارے بھی باہم نہیں ٹکراتے۔ جو طاقت اس کائنات کو چلا رہی ہے وہ کوئی اندھی بہری طاقت نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی ذی شعور ہستی اور قادرِ مطلق ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کائنات میں مجرد قوت اور طاقت ہی کی کارفرمائی ہی نظر نہیں آتی بلکہ یہاں جو چیزیں بھی پائی جاتی ہیں ان میں نفیس ذوق، پاکیزگی اور لطیف ترین شعور و احساس کی کارفرمائی بھی دکھائی دیتی ہے، لیکن کیا کسی ایسی ہستی کا تصور کرنا سائنٹفک بات ہو سکتی ہے جو شعور اور علم و ارادہ رکھتی ہو اور جس کا اپنا مطلق اور مستقل بالذات آزاد وجود ہو۔ شاہ صاحبؒ سورہ الحجر کی مذکورہ آیت کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ انسان کا وجود خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ایک قادرِ مطلق اور ذی شعور ہستی کا متصور ہونا غیر سائنٹفک اور خیالی بات نہیں ہے۔ کسی ایسی ذی شعور ہستی کا وجود کیوں ممکن نہیں ہے۔ جب کہ اس کا ایک پرتو اور نمونہ خواہ وہ کتنا ہی ہلکا اور چھوٹا کیوں نہ ہو انسانی شکل میں موجود ہے جس میں خدا کے علم و ارادہ وغیرہ صفات کا ایک نمونہ خواہ وہ کتنا ہی ہلکا اور محدود کیوں نہ ہو دیکھا جا سکتا ہے، جس کی طرف نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (اس میں ہم نے اپنی روح پھونکی) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے انسان کے شرف کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ محض خاک کا کوئی ڈھیر نہیں ہے۔ وہ تو خدائے رحمٰن کی ایک پھونک اور سانس ہے اسے اپنی عزت اور شرف کا احساس ہونا چاہیے۔

شاہ صاحبؒ نے نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ سے یہ استنباط فرمایا ہے کہ انسان کے اندر اعلیٰ

https://telegram.me/ilmokiab

حقائق کے نمونے موجود ہیں۔ اس میں ایک طرف خدا کی صفاتِ علم وارادہ، حکمت تدبیر وغیرہ کا پرتو اور نمونہ دیکھا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اس کے اندر اپنے سرچشمۂ وجود وحیات کے لیے انتہائی لگاؤ اور کشش پائی جاتی ہے۔ خدا کی یاد اس کی اصل غذا ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کی صفات کا علم اور تدبیر اور یاد حق کی اور لگاؤ اللہ سے۔''

(٢) اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثاً وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○

(المومنون:١١٥)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی کھلواڑ کے طور پر پیدا کیا ہے اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے۔''

شاہ صاحبؒ نے یہاں ایک گہری بات فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یعنی دنیا میں تو نیکی اور بدی کا اثر نہیں ملتا۔ اگر دوسرا دن نہ ہوتا بدلے کا تو یہ سب کھیل تھا۔''

مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے واضح اور کامل نتائج تو دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے یہاں تو اس کا بھی امکان ہے کہ برائی کر کے کوئی خوش حال ہو اور نیکی کر کے بھی ایک آدمی پریشانی کی حالت میں زندگی گزارتا ہو۔ اب اگر آخرت کو تسلیم نہ کیا جائے جہاں نیکی اور بدی کے حقیقی ثمرات سامنے آئیں گے تو اس صورت میں تو موجودہ زندگی اپنی ساری معنویت کھودے گی جب تک اس کا کوئی حقیقی اور دائمی مقصد نہ ہو اس کی حیثیت اہل نظر کے نزدیک کھیل اور تماشے سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ زندگی اور کائنات بے فائدہ اور بے مقصد نہیں ہوسکتی، جس کائنات میں اتنی دانائی اور حکمت پائی جاتی ہو جس کا احاطہ کرنا کسی فرد بشر کے لیے ممکن نہیں اسے محض کھلنڈرے کا کھیل سمجھنا معقول بات نہیں ہوسکتی۔

(٣) وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلاً مَّيْسُوْراً○ (بنی اسرائیل:٢٨)

''اگر تم اپنے رب کی رحمت کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان کی طرف توجہ نہ کرسکو تو ان سے نرم بات کرو۔''

https://telegram.me/ilmokiab

یہاں شاہ صاحب نے ایک ایسی گہری نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا، جس کا بہت کم لوگوں کو خیال ہوتا ہے۔ اللہ کی سخاوت اور فیاضی اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا حد درجہ پسند ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ اگر کسی وقت تم کچھ دینے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اُس وقت سائل کو مت جھڑکو اور نہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ انفاق کی اصل حقیقت تو ہمدردی اور سوز محبت کا جذبہ ہے اور حقیقت میں یہ مومن کے اپنے دل کا ایک نشاط ہے۔ اس لیے اگر کسی وقت دینے کو تمہارے پاس نہ ہو تو اس حالت میں بھی محبت اور ہمدردی کا جذبہ تو تمہارے اندر ہونا ہی چاہیے۔ یہ جذبہ کسی صورت میں ختم نہیں ہونا چاہیے۔ ہمدردی اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ضرورت مند کی ضرورت پوری نہ کر سکو تو کم از کم نرم گفتگو تو اس سے کرنی چاہیے۔ اگر یہ بات تم میں نہیں ہے بلکہ محتاجوں کے ساتھ تم سختی کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر وہ داعیہ ہی مفقود ہو کر رہ گیا ہے جو انفاق کا اصل محرک ہے۔ اگر اصل داعیہ باقی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پچھلی خیراتیں جو تم نے کی ہیں یا تو وہ محض دنیا کو دکھانے کے لیے کی تھیں یا کسی اور غرض کی تکمیل کے لیے یا پھر اب کسی وجہ سے ان کے اثرات تمہارے اندر باقی نہ رہے۔ جب تمہاری نفسیات ان کے اثرات سے بے گانہ ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خیراتیں اکارت ہو گئیں۔ خدا کی اصل نگاہ تو ظاہر کو نہیں دیکھتی۔ اس کے یہاں تو ہر عمل کی روح اور حقیقت محسوب (Count) ہوتی ہے۔ ظاہری عمل کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے آدمی کے کسی غلط رویہ سے اس کے اعمال ضائع اور برباد قرار پا سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے سچ بولنے والا آدمی جب جھوٹ بولنے لگتا ہے تو پھر وہ سچا نہیں رہتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"اگر ایک وقت تو نہ دے تو میٹھے جواب کہہ کہ اگلی سب خیراتیں برباد نہ ہوں۔"

(۵) فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ (الطارق:۵-۸)

"انسان کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اچھلتے پانی سے پیدا ہوا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ بے شک خدا کو اسے پھیر لانے کی پوری قدرت حاصل ہے۔"

https://telegram.me/ilmokiab

مطلب یہ ہے کہ جو خدا انسان کو پانی کے ایک ناچیز قطرے سے پیدا کرتا ہے اس کے لیے کسی کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ اگر کوئی زندگی بعد موت کو ناممکن سمجھتا ہے تو اس کا یہ خیال بے بنیاد اور حقائق کے بالکل خلاف ہے۔

شاہ صاحبؒ نے یہاں ایک لطیف حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں کچھ اسی کی وضاحت کرنی چاہتا ہوں۔ اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ (بے شک وہ اس کو پھیر کے لاسکتا ہے) کی تشریح میں شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''یعنی اللہ دنیا میں پھیر لاوے گا مرنے کے بعد۔''

تمام قدیم نسخوں میں شاہ صاحب کے یہی الفاظ ملتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ شبہ کیا ہے کہ اس فقرے میں ''دنیا میں'' کے الفاظ کسی تصرف کا نتیجہ ہیں۔ شاہ صاحب ''دنیا میں پھر لاوے گا'' کیسے لکھ سکتے ہیں کیوں کہ اس سے تو تناسخ کے عقیدہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ من وعن شاہ صاحب کا ہے۔ یہ کسی تصرف کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے۔ اس فقرے کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں ''دنیا میں'' کے الفاظ آنے ضروری ہیں۔ اس کے بغیر اس فقرے کا کوئی واضح مفہوم سامنے نہیں آتا۔ شاہ صاحب نے یہ فقرہ آیت اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ کی تشریح میں لکھا ہے۔

اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''بے شک وہ اس کو پھیر لاسکتا ہے۔''

اس کی تشریح شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے:

''یعنی اللہ دنیا میں پھیر لاوے گا مرنے کے بعد۔''

اس سے آیت کا مفہوم اور مطلب واضح ہوتا ہے، لیکن اگر ''دنیا میں'' نکال کر پڑھیں تو یہ فقرہ یہ ہوگا۔ ''یعنی اللہ پھیر لاوے گا مرنے کے بعد۔''

اس عبارت میں پھیر لانے کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کہاں پھیر لائے گا؟ پھر تشریح ہی کیا ہوئی۔ اس کے علاوہ کسی کو پھیر لانا اسی وقت کہیں گے جب کہ جہاں سے وہ آیا ہو وہیں اسے لوٹایا جائے۔ اس لیے یہ فقرہ ''یعنی اللہ دنیا میں پھیر لاوے گا مرنے کے

https://telegram.me/ilmokiab

بعد۔'' شاہ صاحبؒ ہی کا ہے۔ اس میں شک وشبہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اب آیئے شاہ صاحب کے اس وضاحتی فقرے پر غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ شاہ صاحب نے ایسی بات کیوں لکھی ہے، جس میں بہ ظاہر قباحت معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ محض دنیا میں پھیر لانے کی بات سے عقیدہ تناسخ کی تائید نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ پھیر لانے کی بات شاہ صاحبؒ نے قیامت سے پہلے کے لیے نہیں کہی ہے۔ تناسخ کے نظریہ کی تائید تو اس وقت ہوسکتی تھی جب کہ شاہ صاحب یہ فرماتے کہ'' اللہ دنیا میں پھیر لاتا ہے مرنے کے بعد'' کیوں کہ نظریۂ تناسخ کے لحاظ سے آدمی کے مرنے کے بعد ہی دنیا میں کہیں نہ کہیں دوسرا جنم لے لیتا ہے۔

یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا اسی دنیا کو عالم آخرت میں تبدیل فرمادے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (الانفطار:۴)

''جب قبریں اُکھیڑ دی جائیں گی۔''

ان قبروں کا تعلق تو اسی دنیا سے ہے جس میں وفات پائے ہوئے لوگ زندہ ہو کر نکلیں گے۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ آج یہاں ہمیں صرف زندگی ہی حاصل نہیں ہے، بلکہ ہم ایک آباد دنیا کے اندر سانس لے رہے ہیں۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ جس خدا نے تمھیں ایک وسیع وعریض دنیا میں ایک معاشرے کے اندر پیدا فرمایا ہے جہاں ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں تمھیں حاصل ہیں۔ اس خدا کے لیے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ تمھیں دوبارہ اسی طرح کی ایک دنیا میں لا آباد کرے، جو آباد بھی ہو، جہاں تمھیں اہل ایمان کا ایک پاکیزہ ترین معاشرہ بھی میسر آئے، جو اس موجود دنیا سے کہیں زیادہ فائق وبرتر ہو۔ یہاں جو خامیاں اور نقائص پائے جاتے ہیں وہ وہاں نہ پائے جاتے ہوں۔ جہاں انسانوں کی تمام ہی آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہوسکیں۔ جہاں نہ موت کا اندیشہ ہو اور نہ کوئی پریشانی پائی جاتی ہے۔

(۳۰) لطیف استنباط

یَسْاَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ○ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا ○ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا ○ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا ○ کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا

https://telegram.me/ilmokiab

لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰہَا ۝ (النزعت: ۴۲-۴۶)

''تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ قیامت کی گھڑی کب آ کر ٹھہرے گی۔ تمہارا کیا کام اس کو بتاؤ۔ اس کا علم تو تمہارے رب پر ختم ہے۔ تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو ہر اس شخص کو جسے اس کا خوف ہو۔ جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ان کو ایسا محسوس ہوگا کہ ایک دن کے پچھلے یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں۔''

یعنی گزری ہوئی درمیان کی مدت ہرگز دراز نہیں معلوم ہوگی۔ وقت کا معاملہ تو جسمانی اور مادی وجود کے ساتھ ہے۔ روح کی دنیا میں وقت اور مکان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں وقت کا گزر نہیں ہوتا۔ وقت تو ایک اضافی چیز ہے جو مختلف تغیرات کے سبب وہم میں آتی ہے۔ انسان کو وقت کا احساس اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ جسمانی طور پر اس زمان و مکان کی حدود میں رہ کر زندگی گزار رہا ہے۔ مرنے کے بعد تو صرف روح باقی رہتی ہے۔ وقت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ شاہ صاحبؒ نے یہاں ایک نہایت لطیف استنباط فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منکرین کہا کرتے ہیں کہ جس قیامت کی خبر دی جا رہی ہے وہ آخر آ کیوں نہیں جاتی۔ وہ اس کے لیے جلدی مچا رہے ہیں لیکن جب قیامت واقع ہوگی تو انہیں معلوم ہوگا کہ قیامت کے آنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ ہماری بے صبری تو ہماری بے خبری کے سوا کچھ اور نہ تھی۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''یعنی شتاب مانگتے ہیں قیامت۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ بہت شتاب آئی۔ بیچ میں دیر کچھ نہیں لگی۔''

سورہ المؤمنون کی آیت ۱۱۳ کے ضمن میں بھی شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''دنیا میں عذاب کی شتابی کرتے تھے۔ اب جانا کہ شتاب ہی آیا۔''

(۲) وَ الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ۝ (الفرقان: ۶۴)

''جو اپنے رب کے آگے سجدے اور قیام کی حالت میں راتیں بسر کرتے ہیں۔''

یہ خدائے رحمٰن کے فرماں بردار بندوں کے اوصاف میں سے ایک خاص وصف کا ذکر فرمایا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی راتیں فسق و فجور اور غفلت کی حالت میں بسر نہیں ہوتیں بلکہ رات کے اوقات میں بھی وہ اپنے رب کے ہو کر رہتے ہیں۔ اپنے رب ہی کے پاس حقیقی چین اور راحت اُنہیں حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی ذات سے ان کی ساری امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔

https://telegram.me/ilmokiab

یہاں شاہ صاحب نے ایک خاص پہلو کا ذکر کیا ہے، جس سے ان کی دقت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے بارے میں یہ تو کہا گیا کہ ان کی راتیں سجدے اور قیام میں بسر ہوتی ہیں لیکن رکوع کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ رکوع بھی نماز کا ایک اہم حصہ ہے۔ اصل میں سجدے کو اگر وسیع معنوں میں لیا جائے تو رکوع بھی اس میں شامل ہے، بلکہ رکوع ہی کی ایک انتہائی شکل ہے، جس کو سجدہ کہتے ہیں۔ رکوع سجدہ ہی کی ابتدائی صورت ہے۔ اس کے علاوہ نماز میں غالب حصہ قیام اور سجدہ ہی کا ہوتا ہے، چناں چہ ہر رکعت میں ایک رکوع اور سجدے دو رکھے گئے ہیں۔ قیام رکوع اور سجدے کے مقابلہ میں لمبا ہوتا ہے۔ نماز کا غالب حصہ دراصل پوری نماز کا عنوان ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں:

"رکوع کو نہیں کہا۔ رکوع بہت لمبا نہیں ہوتا۔"

(۳) قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ (ص:۷۵)

"فرمایا، اے ابلیس جس کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھ سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا۔"

جسے ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا یعنی جس کی تخلیق میں ہم نے کوئی کمی یا نقص نہیں رہنے دیا، جس کو ہم نے ظاہری اور باطنی دونوں ہی طرح کے کمالات عطا کیے۔ جس کو اگر روح بنایا تو اسے مناسب اور موزوں جسم بھی عطا کیا۔ جس کو بنایا ہی نہیں بلکہ خوب تر بنایا۔ جس کے اندر ہم نے بڑے امکانات رکھے، جس کو ہم نے ہر طرح سے نوازا۔ اس کی وضاحت شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے:

"دو ہاتھوں سے یعنی بدن کو ظاہر کے ہاتھ سے اور روح کو غیب کے ہاتھ سے۔ اللہ غیب کی چیزیں بناتا ہے، ایک طرح کی قدرت سے اور ظاہر کی چیزیں ایک طرح کی قدرت سے۔ اس انسان میں دونوں طرح کی قدرت خرچ کی۔"

(۳۱) اَمثال

(۱) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ

https://telegram.me/ilmokiab

اَللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ○ (النور:۳۹،۴۰)

”کفر کرنے والوں کے اعمال میدان میں سراب کے مانند ہیں۔ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے لاشے پاتا ہے اور اس کے نزدیک خدا کو پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔ اللہ جلد حساب لیتا ہے۔ یا جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیاریاں اوپر ایک موج چھائی ہوئی اس پر ایک موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے، جس کو اللہ ہی نور فراہم نہ کرے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔“

قرآن مجید نے منکرین حق کے اعمال اور ان کے فکر کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بہت بامعنیٰ ہیں۔ منکروں کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ منکر تو ایسے ہوتے ہیں جن کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ حقیقت مادّیت سے ماورا ہے۔ عالم ظاہر کے ساتھ کوئی عالم غیب بھی ہے کوئی غیبی ہستی بھی ہے جو نظامِ عالم کو چلا رہی ہے۔ اس سے بےخبر رہ کر انسان بھٹک ہی سکتا ہے راہ نہیں پا سکتا۔ ایسے لوگ غیب کی طرف متوجہ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن بھٹک بھٹک جاتے ہیں اور موہوم خیالات سے اپنے کو وابستہ کر رکھتے ہیں۔ حق اور ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کا انجام ظاہر ہے۔ سراب کو پانی سمجھنے سے وہ پانی تو ہونے سے رہا۔ پیاسے کے حصے میں حسرت اور مایوسی ہی آئے گی۔ حق سے بیگانہ رہنے والا خدا کے یہاں اپنے کرتوتوں کی پوری سزا پا کر رہے گا۔

دوسری قسم کے منکر وہ ہیں جو غیب کی طرف سرے سے متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ ان کے ذہن ودماغ پر دنیا اور مادّیت ہی چھائی ہوئی ہے۔ اسی کو وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ پرستش بھی کرتے ہیں تو غیبی خدا کی نہیں بلکہ پتھر پوجتے ہیں۔ ان کے پاس سراب بھی نہیں جس سے کم سے کم دیر تک آدمی کو پانی کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ روشنی کا نام ونشان تک نہیں پایا جاتا۔ حق کا ملنا تو الگ رہا، یہاں تو سرے سے وہ زمین ہی نہیں، جس پر حق کا درخت قائم ہو سکے اور برگ وبار لا سکے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

https://telegram.me/ilmokiab

"کافر دو طرح کے ہیں۔ ایک غیب کی طرف تاکتے، پھر بہک کر اللہ کا دین چھوڑتے ہیں۔ غلط راہیں پکڑتے ہیں۔ یہ ان کی کہاوت ہے۔ ریت کو پانی سمجھ کر دوڑے، وہاں پانی نہ ملا۔ آخرت میں اپنے گناہوں کی سزا ملی۔ دوسرے وہ ہیں جو دنیا میں غرق ہیں یا پتھر پوجتے ہیں۔ ان کی کہاوت آگے فرمائی۔ ان کے پاس ریت بھی نہیں۔ اندھیرے میں بند ہو رہے ہیں۔"

(۲) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ○ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ○ (البقرۃ:۱۷،۱۸)

"ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آگ جلائے۔ پھر جب آگ نے اس کے گرد و پیش کی چیزوں کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی چھین لی اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھتے نہیں، وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ لوٹنے کے نہیں۔"

یہاں منافقوں کی مثال پیش کی گئی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حق کی روشنی فراہم کی تو اس روشنی سے سارا ماحول روشن ہو گیا، ہر چیز اپنی صحیح شکل میں دکھائی دینے لگی۔ عین اس وقت جب کہ حق کی روشنی نمودار ہوئی، منافقوں کی بصارت ہی جاتی رہی۔ ظاہر ہے اندھے کے لیے مشعل بے سود ہے۔ لیکن وہ اندھے ہی نہیں بہرے اور گونگے بھی ہو گئے۔ اپنی آنکھوں سے خود تو روشنی دیکھنے سے رہے۔ بہرے ہونے کی وجہ سے کسی کی سن بھی نہیں سکتے۔ اور گونگے ہیں اس لیے کسی سے دریافت بھی نہیں کر سکتے۔ مصلحت کوشی اور دنیا طلبی نے ان کی تمام فطری صلاحیتیں چھین لیں۔ ان کے لیے ہدایت کے سارے ہی دروازے بند ہو کر رہ گئے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"اللہ کے نبی نے دین اسلام روشن کیا اور خلق نے اس میں راہ پائی۔ اور منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ آنکھ کی روشنی نہ ہو تو مشعل کیا کام آوے۔ کاش کہ نرا اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سنے۔ بہرا بھی ہو اور گونگا بھی وہ کیوں کر راہ پر آوے۔"

(۳۲) بعض اہم مقامات

(۱) وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ (آل عمران:۸۱)

https://telegram.me/ilmokiab

"یاد کرو جب اللہ نے نبیوں کا عہد لیا کہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے نوازا ہے۔ پھر کوئی رسول تمہارے پاس اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنی لازم ہے۔"

مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ (نبیوں کا عہد) کے مفہوم کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ کل تمہارے پاس کوئی نبی آئے تو اسے ماننا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ نبیوں سے جو عہد لیا گیا وہ لامحالہ ان کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا جو مفہوم شاہ صاحب لیتے ہیں وہ نہایت واضح اور عربیت سے زیادہ قریب ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"اللہ نے اقرار لیا نبیوں کا یعنی نبیوں کے مقدمہ میں بنی اسرائیل سے اقرار لیا۔"

یعنی یہ عہد نبیوں کے بارے میں بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ وہ آنے والے نبیوں کا ساتھ دیں گے۔ انبیاء علیہم السلام کا مشن اور مقصد مشترک رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں کی راہیں الگ الگ رہی ہوں۔ ہر نبی اپنے سے پہلے کے نبیوں کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے۔ تردید کرتا ہوا نہیں آیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے جو مفہوم لیا ہے وہ نہایت واضح ہے۔ اس میں کسی تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

(۲) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ (الحج:۱۸)

"کیا تو نے دیکھا نہیں کہ جو کوئی آسمانوں اور جو کوئی زمین میں ہے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی، لیکن بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔"

زمین و آسمان کی ساری ہی چیزیں خدا کے آگے سر بہ سجود ہیں۔ سورج چاند، ستارے اور شجر، حجر سبھی اس کے سامنے سر بہ سجود ہیں۔ ان کے سجدے خدا ہی کے لیے ہیں۔ لیکن انسانوں کا معاملہ ان سے کچھ مختلف ہے۔ کتنے ہی انسان تشریعی معاملہ میں سجدہ سے گریز کرتے اور خود کو

https://telegram.me/ilmokiab

عتابِ الٰہی کا مستحق بناتے ہیں۔ حالاں کہ تکوینی پہلو سے دیکھا جائے تو ان کی زندگی بھی سجدہ ہی کے سبب قائم ہے۔ خدا کی قدرت اور اختیار میں بے بس اور اس کے تابع ہونا یہ بھی سجدہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ سجدہ کا ایک پہلو اور بھی ہے، جس کے لحاظ سے ہر ایک کے کام الگ الگ ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً سورج کے سر بہ سجدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چمکے اور سارے عالم میں روشنی پھیلائے۔ درختوں کا سجدہ میں ہونا یہ ہے کہ وہ اپنا سایہ پھیلائیں اور پھلیں پھولیں تا کہ لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچے۔

اس پہلو سے دیکھتے ہیں تو کتنے ہی انسان سجدے سے پھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خدا کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک سجدہ ہے کہ سب اس میں شامل ہیں۔ آسمان زمین میں جو کوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ قدرت میں بے بس ہیں اور ایک سجدہ ہے ہر ایک کا جدا وہ یہ کہ اس کو جس کام کا بنایا اس کام میں لگے۔ یہ بہت آدمی کرتے ہیں، بہت نہیں کرتے اور خلق سارے کرتے ہیں۔''

سرکشی آتی ہے تو انسانوں ہی کے حصے میں آتی ہے۔ دیگر مخلوقات تو اسی راہ پر لگی ہوتی ہیں۔ جس پر خدا نے ان کو لگایا ہوتا ہے۔

(۳) بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةًۙ كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَؕ كَلَّاۤ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗؕ (المدثر:۵۲-۵۵)

''بلکہ ان میں ہر ایک چاہتا ہے کہ اسے کھلے صحیفے عطا کیے جائیں۔ ہرگز نہیں، بات یہ نہیں ہے بلکہ انہیں آخرت کا خوف ہی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔''

یہ مطالبہ کہ ہر ایک کو خدا کی طرف سے کتاب عطا ہو زیادتی ہے۔ کتاب کی ضرورت تو ہے مگر اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر ایک کے پاس براہِ راست خدا کی کتاب اُترے۔ کتاب کسی کے پاس بھی آئے اگر سب کے لیے اس میں ہدایت ونصائح ہیں تو بس وہ کتاب سب کے لیے کافی ہے۔ ہر ایک کے پاس الگ الگ کتاب اُتارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن خدا

https://telegram.me/ilmokiab

کی کتاب ہے یا نہیں اس کے جانچنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ صرف یہی ایک ذریعہ اس کے لیے نہیں ہے کہ وہ براہِ راست ہم پر نازل ہو تب ہم جانیں گے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ ہدایت اور راہ نمائی کے لیے کسی ایک شخص پر اس کا نازل ہونا کافی ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''یعنی ایک پر اُتری تو کیا ہوا کام تو سب کے آتی ہے۔''

(۴) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ (التوبہ:۳۳)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس کو سارے دین کے اوپر رکھے، اگر چہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی بری کیوں نہ لگے۔''

دین کے غالب اور سب دین سے اوپر ہونے کے مفہوم کے سلسلے میں شاہ صاحب نے ایک خاص پہلو کا ذکر فرمایا ہے، جس کی طرف عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ دین سب سے اوپر ہے عقل کے نزدیک اور خدا کے نزدیک یعنی جو اس سے قرب ملے سو اور سے نہیں۔''

اس دین کے سب سے اوپر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر اعتبار سے یہ دین فائق اور برتر ثابت ہو کر رہے۔ اس کے ذریعے سے خدا کا معتبر قرب حاصل ہوتا ہے جو کسی اور طرح سے میسر نہیں آتا۔ اس دین کے سوا جو کچھ بھی ہوگا وہ گمان اور اٹکل ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ گمان اور اٹکل کبھی بھی یقین اور ایمان کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اہلِ نظر کے نزدیک دینِ حق کو یہ فوقیت اور برتری ہر حال میں حاصل رہے گی۔ اگر چہ بے بصیرت اور اندھے لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکیں۔ دینِ حق کو اس طرح کی برتری اس صورت میں بھی حاصل رہے گی جب کہ اُسے اقتدار حاصل نہ ہو۔ اس دین میں بااقتدار ہونے کی بھی صلاحیت موجود ہے، اور اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ بااقتدار ہونا بھی چاہتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ایک گروہ اس کے لیے کوشاں ہو اور اس سلسلے کی تمام ذمہ داریوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ ہو خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی مشکلات اور مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

(۵) وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ

https://telegram.me/ilmokiab

بِسِيْمٰهُمْ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ○ (الاعراف:۴۶)

"اور دونوں کے بیچ ایک دیوار ہے اور اس کے سرے پر کچھ لوگ ہوں گے جو سب کو ان کی صورتوں سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ سلام ہو تم پر حالاں کہ ابھی وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے لیکن امیدوار ہوں گے۔"

اہلِ اعراف یا بلندی کے یہ لوگ کون ہوں گے؟ عام طور پر خیال جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس نہ تو اتنی نیکیاں ہوں گی کہ جنت میں داخل کر دیے جائیں اور نہ ان میں اتنی برائیاں ہوں گی کہ اُنہیں دوزخ میں ڈالا جا سکے۔ اس لیے وہ درمیانی جگہ رکھے جائیں گے اور وہ خدا سے بخشش کی آس لگائے ہوں گے۔ لیکن شاہ صاحب کے نزدیک اہلِ اعراف سے مراد دراصل ایسے لوگ ہیں، جن کے درجے سب لوگوں کے مقابلے میں بلند ہوں گے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"جنت دوزخ کے بیچ دیوار ہوگی۔ اس کے سرے پر مرد ہیں نجات والے جو حشر اور حساب سے فارغ ہیں۔ بہشتی اور دوزخی کو نشان سے پہچان کر جنت والوں کو خوش خبری کہیں گے۔ سلامتی کے یہ بھی امیدوار ہیں۔ خوش خبری سن کر خوش ہوں گے۔"

مطلب یہ ہے کہ اعراف کے لوگ جب عام اہل جنت کو جو ابھی جنت میں داخل نہ ہوں گے لیکن اُنہیں جنت میں پہنچنے کی امید ہوگی پکاریں گے اور ان کو خوش خبری دیں گے تو اس سے انہیں بے انتہا مسرت ہوگی۔ شاہ صاحب نے اس آیت کا جو مفہوم لیا ہے بعض دوسرے مفسرین کے نزدیک بھی وہی صحیح ہے۔ نظم کلام اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی شاہ صاحب کی رائے ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(٦) اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم:۴)

"اگر تم دونوں اللہ کی طرف پلٹو تو یہ اقرب ہے کیوں کہ تمہارے دل تو مائل ہی ہو چکے ہیں۔"

شاہ صاحب نے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا کا ترجمہ کیا ہے "تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے" یہی ترجمہ صحیح ہے۔ جن لوگوں نے اس سے مراد دل کے کج یا منحرف ہونے کے لیے

https://telegram.me/ilmokiab

ہیں ان سے خطا ہوئی ہے۔ صغو کے معنی کسی شے کی طرف جھکنے کے ہوتے ہیں۔ کسی شے سے لڑنے یا ہٹنے کے نہیں ہوتے۔ مثلاً کان یصغی بھا الاناء ''اس کے لیے برتن کو جھکا دیتے تھے کہ وہ آسانی سے پی سکے۔'' پھر آیت کا اسلوب خود اس بات کی ایک واضح شہادت ہے کہ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا کے معنی لازماً ''تمہارے دل تو جھک ہی چکے ہیں'' ہوں گے۔ اس اسلوب کی کتنی ہی مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

وَ اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ ؕ (فاطر:۴)

''اور اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں تم سے پہلے دوسرے انبیاء کو بھی جھٹلایا جا چکا ہے۔''

ایک دوسری جگہ ہے:

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَکُمُ الْفَتْحُ ج (الانفال:۱۹)

''اگر تم فتح چاہتے ہو تو لو فتح آ گئی۔''

اس اسلوب کے لحاظ سے بھی آیت زیر غور کا ترجمہ یہی صحیح رہے گا اگر تم دونوں اللہ کی طرف لوٹو تو یہ تو ہونا ہی ہے کیوں کہ تم دونوں کے دل تو مائل ہی ہو چکے ہیں۔

پھر یہ معاملہ کسی اور کا نہیں بلکہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات میں دو بیویوں کا ہے، جن کے بارے میں یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ ان کے اندر کبھی حقیقی انحراف اور کجی آئی ہو اور خدا اور رسول کی محبت سے وہ کبھی بے گانہ ہوئی ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کی تربیت کا خود خاص اہتمام فرمایا تھا۔ اس لیے کہ انہیں دین کی تبلیغ و اشاعت کے کاموں میں پیغمبرِ اسلامؐ کا معاون بننا تھا۔

(۷) وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ (ص:۲۷)

''آسمان اور زمین کو اور اُن کے درمیان جو کچھ ہے اسے ہم نے نکما نہیں بنایا۔ یہ خیال ہے اُن کا جو منکر ہیں سو خرابی ہے منکروں کی آگ سے۔''

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''نکما یعنی جس کا اثر کچھ نہ نکلے آگے، بلکہ اس دنیا کا اثر ہے آخرت میں۔''

https://telegram.me/ilmokiab

شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے مختصر سے الفاظ میں نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کسی گہری حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے گہری نگاہ درکار ہوتی ہے۔ قرآن اپنے پیروؤں کے اندر ایسی ہی گہری نظر پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُنہیں گہرائی تک لے جاسکے۔ قرآن جو نقطۂ نظر عطا کرتا ہے اس کی رو سے ہر وہ چیز بے معنی اور باطل ہے جس کا کوئی دائمی اور پائیدار اثر مرتب نہ ہو۔ اس لیے اگر دنیا میں کوئی محض دنیا ہی کے لیے منہمک ہوتا ہے تو اس کے اس انہماک کو لہو ولعب یا کھیل اور تماشے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دنیا کے نتیجے اور اثر کی شکل میں اگر آخرت سامنے آنے والی نہ ہوتی تو پھر یہ دنیا اور اس کی ساری چیزیں ہی باطل، نکمی اور لایعنی قرار پاتیں۔ قرآن متنبہ کرتا ہے کہ خدا نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر پائی جانے والی چیزوں کو باطل اور بے کار نہیں بنایا ہے۔ ان کا ہمیشہ باقی رہنے والا نتیجہ و اثر آخرت کی شکل میں سامنے آنے والا ہے۔ تخلیق کائنات ان ہی لوگوں کے خیال میں باطل ہوسکتی ہے اور وہی لوگ اس کو حقیقی اور دائمی اثر و نتیجہ سے خالی سمجھتے ہیں، جن کے اندر کفر و انکار کی خصلت پائی جاتی ہے، جو کسی آخرت کو نہیں مانتے جو اسی موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر دنیا ہی سب کچھ ہے تو پھر ساری چیزیں بے فائدہ اور باطل قرار پائیں گی۔ اس لیے کہ دنیا تو باقی رہنے والی نہیں ہے۔ یہاں کی ساری چیزیں آدمی سے چھن جاتی ہیں۔ دنیا تو عارضی اور زوال پذیر ہے۔ لیکن جس کائنات کی تخلیق و انتظام میں عظیم حکمتیں صرف ہوئی ہوں ہرگز بے معنی نہیں ہوسکتی۔ یہ آدمی کی کوتہ نظری ہے کہ وہ اس عظیم تخلیق کے کسی حقیقی انجام کو ماننے سے انکار کرے۔ ایسا آدمی بڑی بے انصافی کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسے شخص کو اپنی ناعاقبت اندیشی اور بے انصافی کے برے نتائج سے لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ اہل نظر کی نظر تو کائنات سے آگے عالم آخرت کو دیکھ لیتی ہے۔ یہ دنیا آخرت کے لیے کوئی حجاب نہیں بلکہ یہ تو آخرت کا آئینہ ہے، جب تک ہماری نگاہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد نہ ہو حقیقت کو سمجھنے سے ہم قاصر رہیں گے۔

---

https://telegram.me/ilmokiab

https://telegram.me/ilmokiab

ISBN 81-8088-432-5
9 788180 884320

₹52.00

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS
NEW DELHI
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

PN- 1442

https://telegram.me/ilmokiab